یہ سردیوں کی یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے۔ میں اپنے گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے مجھے جگا دیا۔

"کون ہے؟ میں نے چیخ کر پوچھا اور اس کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور اندھیرے سے آواز آئی۔ تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔

"کیا؟ میں نے لرزتے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ کیا ہے؟

اور تاریکی کا بھوت بولا۔ تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا----- اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔

داؤ جی کے بچے۔ میں نے روہانسے ہو کر کہا۔ آدھی آدھی رات تنگ کرتے ہیں----- دفع ہو جاؤ---- میں نہیں آپ کے گھر رہتا۔ میں نہیں پڑھتا----- داؤ جی کے بچے--- کتے! اور میں رونے لگا۔

داؤ جی نے چمکار کر کہا۔ اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہو گا؟ پاس نہیں ہو گا تو بڑا آدمی کیسے بنے گا پھر لوگ تیرے داؤ کو کیسے جانیں گے۔

"اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی آپ کو جاننے والے بھی..... اور میں بھی---- میں بھی..... میں بھی.....۔ اپنی جواں مرگی پر میں ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔

داؤ جی بڑے پیار سے میرے سر پر ہاتھ پھیرے جاتے تھے اور کہہ رہے تھے۔

"بس اب چپ کر شاباش----- میرا اچھا بیٹا۔ اس وقت یہ تو ترجمہ کر دے پھر نہیں جگاؤں گا"

آنسوؤں کا تارا ٹوٹتا جا رہا تھا۔ میں نے جل کر کہا۔ آج حرامزادے رانو کو پکڑ کر لے گئے کل کسی اور کو پکڑ لیں گے---- آپ کا ترجمہ تو......"

"نہیں نہیں انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ میرا وعدہ رہا آج کے بعد رات کو جگا کر نہیں پوچھوں گا ---- شاباش اب بتا " تھانے والوں نے رانو کو گرفتار کر لیا۔

میں نے روٹھ کر کہا۔ مجھے نہیں آتا۔

"فورا نہیں کہہ دیتا ہے۔ انہوں نے سر سے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ کوشش تو کرو

"نہیں کرتا۔ میں نے جل کر جواب دیا۔

اس پر وہ ذرا ہنسے اور بولے۔ کارکنان گزمہ خانہ رانو راتوقیف کردند----

کہو۔

مجھے پتہ تھا کہ یہ ٹلنے والی نہیں ناچار گزمہ خانہ والوں کا پہاڑہ شروع کر دیا۔ جب دس مرتبہ کہہ چکا تو داؤ جی نے بڑی لجاحت سے کہا اب سارا فقرہ پانچ مرتبہ کہو۔ جب پچگانہ مصیبت بھی ختم ہوئی تو انہوں نے مجھے آرام سے بستر میں لٹاتے ہوئے اور رضائی اوڑھاتے ہوئے کہا۔ بھولنا نہیں ! صبح اٹھتے ہی پوچھوں گا"

پھر وہ جدھر سے آئے تھے ادھر لوٹ گئے۔

شام کو جب میں ملا جی سے سیپارے کا سبق لے کر لوٹتا تو خراسیوں والی گلی سے ہو کر اپنے گھر جایا کرتا۔ اس گلی میں طرح طرح کی لوگ بستے تھے مگر ی صرف موٹے ماشکی سے واقف تھا جس کو ہم سب "کدو" کریلا ڈھائی آنے کہتے تھے۔ ماشکی کے گھر کے ساتھ بکریوں کا ایک باڑہ تھا جس کے تین طرف کچے مکانوں کی دیواریں اور سامنے کے رخ آڑی ترچھی لکڑیوں اور خار دار جھاڑیوں کا اونچا اونچا جنگلا تھا۔ اس کے بعد ایک چوکور میدان آتا' پھر لنگڑے کمہار کی کوٹھری اور اس کے ساتھ کیرونگی کھڑکیوں اور پیتل کی کیلوں والے دروازے کا ایک چھوٹا سا پکا مکان۔ اس کے بعد گلی میں ذرا سا خم پیدا ہوتا اور قدرے تنگ ہو جاتی۔ پھر جوں جوں اس کی لمبائی بڑھتی توں توں اس کے دونوں بازو بھی ایک دوسرے کے قریب آتے جاتے۔ شاید وہ ہمارے قصبے میں سب سے لمبی گلی تھی اور حد سے زیادہ سنسان! اس میں اکیلے چلتے ہوئے مجھے ہمیشہ یوں لگتا تھا جیسے میں بندوق کی نالی میں چلا جا رہا ہوں اور جونہی میں اس کے دہانے سے باہر نکلوں گا زور سے "ٹھائیں" ہو گا اور میں مر جاؤں گا۔ مگر شام کے وقت کوئی نہ کوئی راہگیر اس گلی میں ضرور مل جاتا اور میری جان بچ جاتی۔ ان آنے جانے والوں میں کبھی کبھار ایک سفید مونچھوں والا لمبا سا آدمی بھی ہوتا جس کی شکل بارہ ماہ والے ملکھی سے بہت ملتی تھی۔ سر پر ململ کی بڑی سی پگڑی۔ ذرا سی خمیدہ کمر پر خاکی رنگ کا ڈھیلا اور لمبا کوٹ۔ کھدر کا تنگ پائجامہ اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ۔ اکثر چپتے ہوئے ہوتے اور وہ آدمی سر جھکائے اور اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرتا۔ جب وہ میرے برابر آتے تو لڑکا میری طرف دیکھتا اور میں اسکی طرف اور پھر ایک ثانیہ ٹھٹکے بغیر گردنوں کو ذرا ذرا موڑتے ہم اپنی اپنی راہ چلے جاتے۔

ایک دن جب میں اور میرا بھائی ٹسیاں کے جوہڑ سے مچھلیاں پکڑنے کی ناکام کوشش کے بعد قصبہ کو واپس آ رہے تھے تو نہر کے پل پر یہی آدمی اپنی پگڑی گود میں ڈالے بیٹھا تھا اور اس کے سفید چٹیا میلی مرغی کے پر کی طرح اس کے سر سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے بھائی نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر زور سے کہا۔ "داؤ جی سلام۔"

اور داؤ جی نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "جیتے رہو۔"

یہ جان کر کہ میرا بھائی اس سے واقف ہے میں بے حد خوش ہوا اور تھوڑی دیر بعد اپنی مٹی آواز میں چلایا۔ "داؤ جی اسلام۔"

"جیتے رہو! جیتے رہو!!" انہوں نے دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا اور میرے بھائی نے تڑاخ سے مجھے زنانے کا ایک تھپڑ دیا۔

"شیخی خورے' کتے۔" وہ چیخا "جب میں نے سلام کر دیا تو تیری کیا ضرورت رہ گئی تھی؟ ہر بات میں اپنی ٹانگ پھنساتا ہے کمینہ ---- بھلا کون ہے وہ؟"

"داؤ جی۔" میرے بھائی نے تنک کر پوچھا۔

"وہ جو بیٹھے ہیں وہ داؤد جی۔" میں نے آنسو پی کر کہا۔

"بکواس نہ کر۔" میرا بھائی چڑ گیا اور آنکھیں نکال کر بولا۔ "ہر بات میں میری نقل کرتا ہے کتا---- شیخی خورا۔"

پھر میں نہیں بولا اور خاموشی کے ساتھ راہ چلتا رہا دراصل مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ داؤ جی سے تعارف ہو گیا۔ اس کا رنج نہ تھا کہ بھائی نے مجھے تھپڑ کیوں مارا۔ وہ تو اس کی عادت ہی تھی۔ بڑا تھا نا! اس لئے ہر بات میں اپنی شیخی بگھارتا تھا۔

داؤ جی سے علیک سلیک تو ہو ہی گئی تھی۔ اس لئے میں کوشش کر کے گلی سے اس وقت گزرنے لگا جب وہ آ جا رہے ہوں۔ انہیں سلام کر کے بڑا مزہ آتا تھا اور جواب پا کر اس سے بھی زیادہ۔ وہ جیتے رہو' کچھ ایسی محبت سے کہتے کہ زندگی دو چند سی ہو جاتی اور آدمی زمین سے ذرا اوپر اٹھ کر ہوا میں چلنے لگتا ---- سلام کا یہ سلسلہ کوئی شام بھر یونہی چلتا رہا اور اس اثنا میں مجھے اسی قدر معلوم ہوسکا کہ داؤ جی کیرورنگی کھڑکیوں والے مکان میں رہتے ہیں اور چھوٹا لڑکا ان کا بیٹا ہے میں نے اپنے بھائی سے

ان کے متعلق کچھ اور بھی پوچھنا چاہا مگر وہ بڑا سخت آدمی تھا اور میری چھوٹی سے چھوٹی بات پر چڑ جاتا تھا۔ میرے ہر سوال کے جواب میں اس کے پاس گھڑے گھڑائے دو فقرے ہوتے تھے۔ "تجھے کیا" اور "بکواس نہ کر۔" مگر خدا کا شکر ہے کہ میرے تجسس کا یہ سلسلہ زیادہ دیر تک نہ چلا۔ اسلامیہ پرائمری سکول سے چوتھی پاس کر کے میں ایم۔بی ہائی سکول کی پانچویں جماعت میں داخل ہوا تو داؤ جی کا لڑکا میرا ہم جماعت نکلا۔ اس کی مدد سے اور اپنے بھائی کا احساس اٹھائے بغیر میں یہ جان گیا کہ داؤ جی کھتری تھے اور قصبہ کی منصفی میں عرضی نویسی کا کام کرتے تھے۔ لڑکے کا نام ای چند تھا اور وہ جماعت میں سب سے ہشیار تھا۔ اس کی پگڑی کلاس بھر میں سب سے بڑی تھی اور چہرہ بلی کی طرح چھوٹا۔ چند لڑکے اسے میاؤں کہتے تھے اور باقی نیولا کہہ کر پکارتے تھے۔ مگر میں داؤ جی کی وجہ سے اس کو اس کے اصلی نام ہی سے پکارتا تھا اس لئے وہ میرا دوست بن گیا اور ہم نے ایک دوسرے کو نشانیاں دے کر پکے یار بنے رہنے کا وعدہ کر لیا۔

گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہونے میں کوئی ایک ہفتہ ہو گا جب میں ای چند کے ساتھ پہلی مرتبہ اس کے گھر گیا۔ وہ گرمیوں کی ایک جھلسا دینے والی دوپہر تھی۔ لیکن شیخ چلی کی کہانیاں حاصل کرنے کا شوق مجھ پر بھوت بن کر سوار تھا اور میں بھوک اور دھوپ دونوں سے بے پروا ہو کر سکول سے سیدھا اس کے ساتھ چل دیا۔ ای چند کا گھر چھوٹا سا تھا لیکن بہت ہی صاف ستھرا اور روشن پیتل کی کیلوں والے دروازے کے بعد ذرا سی ڈیوڑھی تھی آگے مستطیل صحن سامنے سرخ رنگ کا برآمدہ اور اس کے پیچھے اتنا ہی بڑا ایک کمرہ۔ صحن میں ایک طرف انار کا پیڑ۔ حقیق کے چند پودے اور دھنیا کی ایک چھوٹی سی کیاری تھی۔ دوسری طرف چوڑی سیڑھیوں کا ایک زینہ جس کی محراب تلے مختصر سی رسوئی تھی۔ گیرورنگی کھڑکیاں ڈیوڑھی سے ملحقہ بیٹھک میں کھلتی تھیں اور بیٹھک کا دروازہ نیلے رنگ کا تھا۔ جب ہم ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو ای چند نے چلا کر "بے بے نمستے!" کہا اور مجھے صحن کے بیچوں بیچ چھوڑ کر بیٹھک میں گھس گیا۔ برآمدے میں بوریا بچھائے بے بے مشین چلا رہی تھی اور اس کے پاس ہی ایک لڑکی بڑی سی قینچی سے کپڑے قطع کر رہی تھی۔ بے بے نے منہ ہی منہ میں کچھ جواب دیا اور ویسے ہی مشین چلاتی رہی۔ لڑکی نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور گردن موڑ کر کہا۔ "بے بے شاید ڈاکٹر صاحب کا لڑکا ہے۔" مشین رک گئی۔

"ہاں ہاں۔" بے بے نے مسکرا کر کہا اور ہاتھ کے اشارے سے مجھے اپنی طرف بلایا۔ میں اپنے جزدان کی رسی مروڑتا اور ٹیڑھے ٹیڑھے پاؤں دھرتا برآمدے کے ستون کے ساتھ آ لگا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" بے بے نے چمکار کر پوچھا اور میں نے نگاہیں جھکا کر آہستہ سے اپنا نام بتایا۔

"آفتاب سے بہت شکل ملتی ہے۔" اس لڑکی نے قینچی زمین پر رکھ کر کہا۔ "ہے نا بے بے۔"

"کیوں نہیں بھائی جو ہوا۔"

"آفتاب کیا؟" اندر سے آواز آئی۔ "آفتاب کیا بیٹا؟"

"آفتاب کا بھائی ہے داؤ جی۔" لڑکی نے رکتے ہوئے کہا۔ "ای چند کے ساتھ آیا ہے۔"

اندر سے داؤ جی برآمد ہوئے۔ انہوں نے گھٹنوں تک اپنا پانجامہ چڑھا رکھا اور کرتا اتارا ہوا تھا۔ مگر سر پر پگڑی بدستور تھی۔ پانی کی ایک ہلکی سی بالٹی اٹھائے وہ برآمدے میں آ گئے اور میری طرف غور سے دیکھتے ہوئے بولے۔ "ہاں بہت شکل ملتی ہے اور یہ گولو مولو سا ہے۔" پھر بالٹی فرش پر رکھ کے انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا اور پاس ہی کاٹھ کا ایک سٹول کھینچ کر اس پر بیٹھ گئے۔ زمین سے پاؤں اوپر اٹھا کر انہوں نے آہستہ سے انھیں جھاڑا اور پھر بالٹی میں ڈال دیئے۔

"آفتاب کا خط آتا ہے؟" انہوں نے بالٹی سے پانی کے چلو بھر بھر کر ٹانگوں پر ڈالتے ہوئے پوچھا۔

"آتا ہے جی۔" میں نے ہولے سے کہا "پرسوں آیا تھا۔"

"کیا لکھتا ہے؟"

"پتہ نہیں جی ابا جی کو پتہ ہے۔"

"اچھا۔" انہوں نے سر ہلا کر کہا "تو ابا جی سے پوچھا کر نا!۔۔۔۔ جو پوچھتا نہیں اسے کسی بھی بات کا علم نہیں ہوتا۔"

میں چپ رہا۔

تھوڑی دیر انہوں نے ویسے ہی چلو ڈالتے پوچھا۔ "کون سا سپارہ پڑھ رہے ہو؟"

"چوتھا" میں نے وثوق سے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تیسرے سپارے کا؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی پتہ نہیں۔" میر آواز پھر ڈوب گئی۔

"تلک الرسل۔" انہوں نے پانی سے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ پھر تھوڑی دیر وہ ہاتھ جھٹکتے اور ہوا میں لہراتے ہوئے۔ بے بے مشین چلاتی رہی' وہ لڑکی نعمت خانے سے روٹی نکال کر برآمدے کی چوکی پر لگانے لگی اور میں جزدان کی ڈوری کھولتا لپیٹتا رہا۔ ای چند ابھی تک بیٹھک کے اندر ہی تھا اور میں ستون کے ساتھ ساتھ جھینپ کی عمیق گہرائیوں میں اترتا جا رہا تھا۔ معا داؤ جی نے نگاہیں میری طرف پھیر کر کہا۔ سورہ فاتحہ سناؤ۔"

"مجھے نہیں آتی جی۔" میں نے جلدی سے کہا۔

انہوں نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ الحمد للہ بھی نہیں جانتے؟

"الحمد للہ تو جانتا ہوں جی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

وہ ذرا مسکرائے اور گویا اپنے آپ سے کہنے لگے۔ "ایک ہی بات ہے' ایک ہی بات ہے۔!!" پھر انہوں نے سر کے اشارے سے کہا۔ "سناؤ۔"

جب میں سنانے لگا تو انہوں نے اپنا پانجامہ گھٹنوں سے نیچے کر لیا اور پگڑی کا شملہ چوڑا کر کے کندھوں پر ڈال لیا اور جب میں نے ولاالضالین کہا تو میرے ساتھ ہی انہوں نے بھی آمین کہا۔ مجھے خیال ہوا کہ وہ ابھی اٹھ کر مجھے کچھ انعام دیں گے' کیونکہ پہلی مرتبہ جب میں نے اپنے تایا جی کو الحمد سنائی تھی تو انہوں نے بھی ایسے ہی آمین کہا تھا اور ساتھ ہی ایک روپیہ مجھے انعام بھی دیا تھا مگر داؤ جی اس طرح رہے بلکہ اور بھی پتھر ہو گئے۔ اتنے میں ای چند کتاب تلاش کر کے لے آیا اور جب میں چلنے لگا تو میں نے عادت کے خلاف آہستہ سے کہا۔ "داؤ جی سلام" اور انہوں نے ویسے ہی ڈوبے ڈوبے ہولے سے جواب دیا۔ "جیتے رہو۔" بے بے نے مشین روک کر کہا۔ "کبھی کبھی ای چند کے ساتھ کھیلنے آ جایا کر ....."

"ہاں ہاں آ جایا کر۔" داؤ جی چونک کر بولے۔" آفتاب بھی آیا کرتا تھا۔" پھر انہوں نے بالٹی پر جھکتے ہوئے کہا۔ "ہمارا آفتاب تو ہم سے بہت دور ہو گیا۔" اور فارسی کا شعر پڑھنے لگے۔

یہ داؤ جی سے میری باقاعدہ پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات سے میں یہ نتائج اخذ کر کے چلا کہ داؤ جی بڑے کنجوس ہیں۔ حد سے زیادہ چپ سے ہیں اور کچھ بہرے سے ہیں۔ اسی دن شام کو میں نے اپنی اماں کو بتایا کہ میں داؤ جی کے گھر گیا تھا اور وہ آفتاب بھائی کو بہت یاد کر رہے تھے۔

اماں نے قدرے تلخی سے کہا "تو مجھ سے پوچھ تو لیتا' بے شک آفتاب ان سے پڑھتا رہا ہے اور ان کی بہت عزت کرتا ہے مگر تیرے ابا جی ان سے بولتے نہیں ہیں۔ کسی بات پر جھگڑا ہو گیا تھا سو اب تک ناراضی چلی آتی ہے۔ اگر انہیں پتہ چل گیا کہ تو ان کے ہاں گیا تھا وہ خفا ہوں گے۔" پھر اماں نے ذرا ہمدرد بن کر کہا۔ "اپنے ابا سے اس کا ذکر نہ کرنا۔"

میں ابا جی سے بھلا اس کا ذکر کیوں کرتا مگر سچی بات تو یہ ہے کہ میں داؤ جی کے ہاں جاتا رہا اور خوب خوب ان سے مسخری کی باتیں کرتا رہا۔ وہ چٹائی بچھائے کوئی کتاب پڑھ رہے ہوتے۔ میں آہستہ سے ان کے پیچھے جا کر کھڑا ہو جاتا اور وہ کتاب بند کر کے کہتے "گولو آگیا۔" پھر میری طرف مڑتے اور ہنس کر کہتے۔ "کوئی گپ سنا۔" اور میں اپنی بساط اور سمجھ کے مطابق ڈھونڈ ڈھانڈ کے کوئی بات سناتا تو وہ خوب ہنستے۔ بس یونہی میرے لئے ہنستے' حالانکہ مجھے اب محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ ایسی دلچسپ باتیں بھی نہ ہوتی تھیں۔ پھر وہ اپنے رجسٹر سے کوئی کاغذ نکال کر کہتے' لے ایک سوال نکال۔ اس بات سے میری جان جاتی تھی لیکن ان کا وعدہ بڑا رسیلا ہوتا کہ ایک سوال اور پندرہ منٹ باتیں۔ اس کے بعد ایک اور سوال اور پھر پندرہ منٹ باتیں' چنانچہ میں مان جاتا اور کاغذ لے کر بیٹھ جاتا لیکن ان کے خود ساختہ سوال کچھ ایسے الجھے ہوتے کہ اگلی باتوں اور اگلے سوالوں کا وقت بھی نکل جاتا۔ اگر خوش قسمتی سے سوال جلد حل ہو جاتا تو وہ چٹائی کو ہاتھ لگا کر پوچھتے۔ "یہ کیا ہے؟" چٹائی۔ میں منہ پھاڑ کر جواب دیتا۔ "اوں ہوں" وہ سر ہلا کر کہتے "فارسی میں بتاؤ۔" تو میں تنگ کر جواب دیتا۔ "لو جی ہمیں کوئی فارسی پڑھائی جاتی ہے۔" اس پر وہ چمکار کر کہتے۔" میں پڑھاتا ہوں گولو میں جو سکھاتا ہوں۔۔۔۔ سنو! فارسی میں بوریا' عربی میں حصیر۔" میں شرارت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔" بخشو جی بخشو' فارسی بھی اور عربی بھی۔ میں نہیں پڑھتا جی معاف کرو۔" مگر وہ سنی ان سنی ایک کر کے کہے جاتے فارسی بوریا عربی حصیر اور پھر کوئی چاہے اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیتا داؤ جی کے الفاظ گھستے چلے جاتے ۔۔۔۔ ای چند کتابوں کا کیڑا تھا۔ سارا دن بیٹھک میں بیٹھا لکھتا پڑھتا رہتا۔ داؤ جی اس کے اوقات میں مخل نہ ہوتے تھے لیکن ان کے داؤ ای چند پر بھی برابر ہوتے رہتے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر گھڑے سے پانی پینے آیا داؤ جی نے کتاب سے نگاہیں اٹھا کر پوچھا۔ "بیٹا "ڈو" کا ناؤن کیا ہے؟" اس نے گلاس منہ کے ساتھ لگائے لگائے "ڈیڈ" کہا اور پھر گلاس گھڑونچی تلے پھینک کر اپنے کمرے میں آگیا۔ داؤ جی پھر پڑھنے میں مصروف ہوگئے۔ گھر میں ان کو اپنی بیٹی سے بڑا پیار تھا۔ ہم سب اسے بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔ اکیلے داؤ جی نے اس کا نام قرۃ رکھا ہوا تھا۔ اکثر بیٹھے بیٹھے ہانک لگا کر کہتے۔" قرۃ بیٹا یہ قینچی تجھ سے کب چھوٹے گی؟" اور وہ اس کے جواب میں مسکرا کر خاموش ہو جاتی۔ بے بے کو اس نام سے بڑی چڑ تھی وہ چیخ کر جواب دیتی تو نے اس کا نام قرہ رکھ کر اس کے بھاگ میں کرتے بینے لکھوا دیے ہیں۔ منہ اچھا نہ ہو تو شبد تو اچھے نکالنے چاہئیں۔" اور داؤ جی ایک لمبی سانس لے کر کہتے "جاہل اس کا مطلب کیا جانیں۔" اس پر بے بے کا غصہ چمک اٹھتا اور اس کے منہ میں جو آتا کہتی چلی جاتی۔ پہلے کوسنے پھر بد دعائیں اور آخر میں گالیوں پر اتر آتی۔ بی بی روکتی تو داؤ جی کہتے۔ "ہوائیں چلنے کو ہوتی ہیں بیٹا اور گالیاں برسنے کو۔ تم انہیں روکو مت' انہیں ٹوکو مت۔" پھر وہ اپنی کتابیں سمیٹتے اور اپنا محبوب حصیر اٹھا کر چپکے سے سیڑھیاں چڑھ جاتے۔

نویں جماعت کے شروع ہی میں مجھے ایک بری عادت پڑ گئی اور اس بری عادت نے عجیب گل کھلائے۔ حکیم علی احمد مرحوم ہمارے قصبہ کے ایک ہی حکیم تھے۔ علاج معالجے سے تو ان کو کچھ ایسی دلچپی نہ تھی لیکن باتیں بڑی مزے دار سناتے تھے۔ اولیاؤں کے تذکرے جنوں بھوتوں کی کہانیاں اور حضرت سلیمان اور ملکہ سبا کی گھریلو زندگی کی داستانیں ان کے تیر بہدف ٹوٹکے تھے۔ ان کے تنگ و تاریک مطب میں معجون کے چند ڈبوں' شربت کی دس پندرہ بوتلوں اور دو آتشی شیشیوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ دواؤں کے علاوہ وہ اپنی طلسماتی تقریر اور حضرت سلیمان کے خاص صدری تعویذوں سے مریض کا علاج کیا کرتے۔ انہی باتوں کے لئے دور دراز گاؤں کے مریض ان کے پاس کھچے چلے آتے اور فیض یاب ہو کر جاتے۔ ہفتہ دو ہفتہ کی صحبت میں میرا ان کے ساتھ ایک معاہدہ ہو گیا۔ میں اپنے ہسپتال سے ان کے لئے خالی بوتلیں اور شیشیاں چرا کے لاتا اور اس کے بدلے میں وہ مجھے داستان امیر حمزہ کی جلدیں پڑھنے کے لئے دیا کرتے۔ یہ کتابیں کچھ ایسی دلچسپ تھیں کہ میں رات رات بھر اپنے بستر میں دبک کر انہیں پڑھا کرتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ اماں میرے اس رویہ سے سخت نالاں تھیں' ابا جی کو میرے صحت برباد ہونے کا خطرہ لاحق تھا۔ لیکن میں نے ان کو بتا دیا تھا کہ چاہے جان چلی جائے اب کے دسویں میں وظیفہ ضرور حاصل کروں گا۔ رات طلسم ہو شربا کے ایوانوں میں بسر ہوتی اور دن کلاس میں بنچ پر کھڑے ہو کر۔ سہ ماہی امتحان میں فیل ہوتے ہوتے بچا۔ ششماہی میں بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے موقعہ پر حکیم جی کی مدد سے ماسٹروں سے مل ملا کر پاس ہو گیا۔ دسویں میں صندلی نامہ' فسانہ آزاد اور الف لیلہ ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ فسانہ آزاد اور صندلی نامہ گھر پر رکھے تھے لیکن الف لیلہ سکول کے ڈیسک میں بند رہتی۔ آخری بنچ پر میں جغرافیہ کی کتاب تلے سند باد جہازی کے ساتھ ساتھ چلتا اور اس طرح دنیا کی سیر کرتا۔

بائیس مئی کا واقعہ ہے کہ صبح دس بجے یونیورسٹی سے نتیجہ کی کتاب ایم۔بی ہائی سکول پہنچی۔ ای چند نہ صرف سکول میں بلکہ ضلع بھر میں اول آیا تھا۔ چھ لڑکے فیل تھے اور بائیس پاس۔ حکیم جی کا جادو یونیورسٹی پر نہ چل سکا اور پنجاب کی جابر دانش گاہ نے میرا نام بھی ان چھوں لڑکوں میں شامل کر دیا۔ اسی شام قبلہ گاہی نے بید سے میری پٹائی کی اور گھر سے باہر نکال دیا۔ میں ہسپتال کے رہٹ کی گدی پر آبیٹھا اور رات گئے تک سوچتا رہا کہ اب کیا کرنا چاہئے اور کدھر جانا چاہئے۔ خدا کا ملک تنگ نہیں تھا اور میں عمرو عیار کے ہتھکنڈوں اور سندباد جہازی کے تمام طریقوں سے واقف تھا مگر پھر بھی کوئی راہ سجھائی نہ دیتی تھی۔ کوئی دو تین گھنٹے مسلسل اسی طرح ساکت و جامد اس گدی پر بیٹھا زیست کرنے کی راہیں سوچتا رہا۔ اتنے میں اماں سفید چادر اوڑھے مجھے ڈھونڈتی ادھر آ نکلیں اور ابا جی سے معافی لے دینے کا وعدہ کر کے مجھے پھر گھر لے گئیں۔ مجھے معافی وافی سے کوئی دلچپی نہ تھی مجھے تو بس ایک رات اور ان کے یہاں گزارنی تھی اور صبح سویرے اپنے سفر پر روانہ ہونا تھا چنانچہ میں آرام سے ان کے ساتھ جا کر حسب معمول اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔

اگلے دن میرے فیل ہونے والے ساتھیوں میں سے خوشیا' کوڈو اور دیسو بیب مسجد کے پچھواڑے تال کے پاس بیٹھے مل گئے۔ وہ لاہور جا کر بزنس کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ دیسو بیب نے مجھے بتایا کہ لاہور میں بہت بزنس ہے کیونکہ اس کے بھایا جی اکثر اپنے دوست فتح چند کے ٹھیکوں کا ذکر کیا کرتے تھے جس نے سال کے اندر اندر دو کاریں خرید لی تھیں۔ میں نے ان سے بزنس کی نوعیت کے بارے میں پوچھا تو بیب نے کہا لاہور میں ہر طرح کا بزنس مل جاتا ہے بس ایک دفتر ہونا چاہئے اور اس کے سامنے بڑا سائن بورڈ' سائن بورڈ کو دیکھ کر لوگ خود ہی بزنس دے جاتے ہیں۔ اس وقت بزنس سے مراد وہ کرنسی کے نوٹ لے رہا تھا! میں نے ایک مرتبہ وضاحت چاہی تو کوڈو چمک کر بولا۔" یارو دیسو سب کچھ جانتا ہے۔ یہ بتا تو تیار ہے یا نہیں؟"

پھر اس نے پلٹ کر دیبو سے پوچھا۔ "انار کلی میں دفتر بنائیں گے نا؟"
دیبو نے ذرا سوچ کر کہا۔ "انار کلی میں یا شاہ عالمی کے باہر دونوں ہی جگہیں ایک سی ہیں۔"

میں نے کہا "انار کلی زیادہ مناسب ہے کیونکہ وہی زیادہ مشہور جگہ ہے اور اخباروں میں جتنے بھی اشتہار نکلتے ہیں ان میں انار کلی لاہور لکھا جاتا ہے۔"

چنانچہ یہ طے پایا کہ اگلے دن دو بجے کی گاڑی سے ہم لاہور روانہ ہو جائیں گے! گھر پہنچ کر میں سفر کی تیاری کرنے لگا۔ بوٹ پالش کر رہا تھا کہ نوکر نے آ کر شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چلو جی ڈاکٹر صاحب بلاتے ہیں۔"

"کہاں ہیں؟" میں نے برش زمین پر رکھ دیا اور کھڑا ہو گیا۔

"ہسپتال میں۔" وہ بدستور مسکرا رہا تھا کیونکہ میری پٹائی کے روز حاضرین میں وہ بھی شامل تھا۔

میں ڈرتے ڈرتے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھا۔ پھر آہستہ سے جالی والا دروازہ کھول کر ابا جی کے کمرے میں داخل ہوا تو وہاں ان کے علاوہ داؤ جی بھی بیٹھے تھے۔ میں نے سہمے سہمے داؤ جی کو سلام کیا اور اس کے جواب میں بڑی دیر کے بعد جیتے رہو کی مانوس دعا سنی۔

"ان کو پہچانتے ہو؟" ابا جی نے سختی سے پوچھا

"بے شک!" میں نے ایک مہذب سیلز مین کی طرح کہا

"بے شک کے بچے' حرامزادے' میں تیری یہ سب ...."

"نہ نہ ڈاکٹر صاحب۔" داؤ جی نے ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا بچہ ہے اس کو تو ...."

اور ڈاکٹر صاحب نے بات کاٹ کر تلخی سے کہا "آپ نہیں جانتے منشی جی اس کمینے نے میری عزت خاک میں ملا دی۔"

"آپ فکر نہ کریں۔" داؤ جی نے سرجھکائے ہوئے کہا۔ "یہ ہمارے آفتاب سے بھی ذہین ہے اور ایک دن ..."

اب کے ڈاکٹر صاحب کو غصہ آ گیا اور انہوں نے میز پر ہاتھ مار کر کہا۔ "کیسی بات کرتے ہو منشی جی! یہ آفتاب کے جوتے کی برابری نہیں کر سکتا۔"

"کر لے گا' کر لے گا ---- ڈاکٹر صاحب۔" داؤ جی نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "ڈاکٹر صاحب بھول نہ جایئے گا ابھی بھجوا دیجئے گا۔"

ابا جی نے ویسے ہی چڑیں پٹختے "اچھا" کہا اور داؤ جی خدا حافظ کہہ کر میرے ساتھ ہی کمرے سے باہر نکل آئے۔

داؤ جی مجھے ادھر ادھر گھماتے اور مختلف درختوں کے نام فارسی میں بتاتے نہر کے اسی پل پر لے گئے جہاں پہلے پہل میرا ان سے تعارف ہوا تھا۔ اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ کر انہوں نے پگڑی اتار کر گود میں ڈال لی' سر پر ہاتھ پھیرا اور مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پھر انہوں نے آنکھیں بند کر لیں اور کہا "آج سے میں تمہیں پڑھاؤں گا اور اگر جماعت میں اول نہ لا سکا تو فرسٹ ڈویژن ضرور دلوا دوں گا۔ میرے ہی ارادے میں خداوند تعالیٰ کی مدد شامل ہوتی ہے اور اس ہستی نے مجھے اپنی رحمت سے کبھی مایوس نہیں کیا ...."

"مجھ سے پڑھائی نہ ہو گی۔" میں نے گستاخی سے بات کاٹی۔

"تو اور کیا ہو گا گولو؟" انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "میں بزنس کروں گا' روپیہ کماؤں گا اور اپنی کار لے کر یہاں آؤں گا پھر دیکھنا ...."

اب کے داؤ جی نے میری بات کاٹی اور بڑی محبت سے کہا "خدا ایک چھوڑ تجھے دس کاریں دے لیکن ایک ان پڑھ کی کار میں نہ میں بیٹھوں گا نہ ڈاکٹر صاحب۔"

میں نے جل کر کہا۔ "مجھے کسی کی پروا نہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے گھر راضی رہیں میں اپنے یہاں خوش۔"

انہوں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "میری بھی پروا نہیں؟" میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ وہ دکھی سے ہو گئے اور بار بار پوچھنے لگے۔" میری بھی پروا نہیں؟ او گولو میری بھی پروا نہیں؟"

مجھے ان کے لہجہ پر ترس آنے لگا اور میں نے آہستہ سے کہا "آپ کی تو ہے مگر ...." مگر انہوں نے میری بات نہ سنی اور کہنے لگے۔ "اگر اپنے حضرت کے سامنے میرے منہ سے ایسی بات نکل جاتی؟ اگر میں یہ کفر کا کلمہ کہہ جاتا .... تو ۔۔ تو ...." انہوں نے فوراً پگڑی اٹھا کر سر پر رکھ لی اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ "میں حضور کے دربار کا ایک ادنیٰ کتا۔ میں حضرت مولانا کی خاک سے بدتر۔ بندہ ہو کر آقا سے یہ کہتا لعنت کا طوق نہ پہنتا؟" پھر انہوں نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے اور سر بالکل گود میں جھکا کر بولے۔ "میں ذات کا گڈریا۔ میرا باپ منڈا سی کا گوالا۔ میں جہالت کا فرزند۔ میرا خاندان ابوجہل کا خانوادہ اور آقا کی ایک نظر کرم' حضرت کا ایک اشارہ' حضور نے چھو کو منشی چنت رام بنا دیا۔ لوگ کہتے ہیں منشی جی' میں کہتا ہوں رحمتہ اللہ علیہ کا کفش بردار .... لوگ کھتے ہیں...." داؤ جی کبھی ہاتھ جوڑتے' کبھی سر جھکاتے کبھی انگلیاں چوم کر آنکھوں کو لگاتے اور بیچ بیچ میں فارسی کے شعر پڑھتے جاتے۔ میں کچھ پریشان سا پشیمان سا ان کا زانو چھو کر آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا داؤ جی! داؤ جی؟ اور داؤ جی "میرے آقا' حضرت مولانا میرے مرشد۔" کا وظیفہ کئے جاتے۔ جب جذب کا یہ عالم دور ہوا تو نگاہیں اوپر اٹھا کر بولے۔ "کیا اچھا موسم ہے دن بھر گرمی پڑتی ہے تو خوشگوار شاموں کا نزول ہوتا ہے۔" پھر وہ پل کی دیوار سے اٹھے اور بولے۔" چلو اب چلیں بازار سے تھوڑا سا سودا خریدنا ہے۔" میں جیسا سرکش و بدمزاج بن کر ان کے ساتھ آیا تھا اس سے کہیں زیادہ منفعل اور خجل ان کے ساتھ لوٹا گھے پنساری یعنی دیبو یبب کے باپ کی دکان سے انہوں نے گھریلو ضروریات کی چند چیزیں خریدیں اور لفافے گود میں اٹھا کر چل دیئے۔ میں بار بار ان سے لفافے لینے کی کوشش کرتا مگر ہمت نہ پڑتی۔ ایک عجیب سی شرم ایک انوکھی سی ہچکچاہٹ مانع تھی اور اسی تامل اور جھجک میں ڈوبتا ابھرتا میں ان کے گھر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر یہ بھید کھلا کہ اب میں انہی کے ہاں سویا کروں گا اور وہیں پڑھا کروں گا' کیونکہ میرا بستر مجھ سے بھی پہلے وہاں پہنچا ہوا تھا اور اس کے پاس ہی ہمارے یہاں سے بھیجی ہوئی ایک ہری کین لالٹین بھی رکھی تھی۔

بزنس مین بننا اور پاں پاں کرتی پیکارڈ اڑائے پھرنا میرے مقدر میں نہ تھا۔ گو میرے ساتھیوں کی روانگی کے تیسرے ہی روز بعد ان کے والدین بھی انہیں لاہور سے پکڑ لائے لیکن اگر میں ان کے ساتھ ہوتا تو شاید اس وقت انار کلی میں ہمارا دفتر پتہ نہیں ترقی کے کون سے شاندار سال میں داخل ہو چکا ہوتا!

داؤ جی نے میری زندگی اجیرن کر دی' مجھے تباہ کر دیا مجھ پر جینا حرام کر دیا۔ سارا دن سکول کی بکواس میں گزرتا اور رات' گرمیوں کی مختصر سی رات' ان کے سوالات کا جواب دینے میں۔ کوٹھے پر ان کی کھاٹ میرے بستر کے ساتھ لگی ہے اور مونگ رسول اور مرالہ کی نہروں کی بابت پوچھ رہے ہیں۔ میں نے ٹھیک بتا دیا ہے۔ وہ پھر اسی سوال کو دہرا رہے ہیں۔ انہوں نے پھر انہی نہروں کو آگے لاکھڑا کیا ہے۔ میں جل جاتا اور جھڑک کر کہتا۔ "مجھے پتہ نہیں میں نہیں بتاتا۔" تو وہ خاموش ہو جاتے اور دم سادھ

لیتے۔ میں آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرتا تو وہ شرمندگی کنکر بن کر پتلیوں میں اترتی جاتی۔ میں آہستہ سے کہتا۔ "داؤ جی"

"ہوں!" ایک گھمبیر سی آواز آتی۔

"داؤ جی کچھ اور پوچھو۔"

داؤ جی نے کہا "بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے ---- اس کی ترکیب نحوی کرو۔"

میں نے سعادت مندی کے ساتھ کہا "جی یہ تو بہت لمبا فقرہ ہے صبح لکھ کر بتا دوں گا کوئی اور پوچھے۔"

انہوں نے آسمان کی طرف نگاہیں اٹھائے کہا۔ "میرا گولو بہت اچھا ہے۔" میں نے ذرا سوچ کر کہنا شروع کیا۔ بہت اچھا صف' ہے حرف ربط مل کر بنا مسند ...."

اور داؤ جی اٹھ کر چارپائی پر بیٹھ گئے۔ ہاتھ اٹھا کر بولے۔ "جان پدر کیوں تجھے پہلے بھی کہا ہے مسند الیہ پہلے بتایا کر۔"

میں نے ترکیب نحوی سے جان چھڑانے کے لئے پوچھا۔" آپ مجھے جان پدر کیوں کہتے ہیں۔ جان داؤ کیوں نہیں کہتے؟"

"شاباش۔" وہ خوش ہو کر کہنے لگے۔" ایسی باتیں پوچھنے کی ہوتی ہیں۔ جان لفظ فارسی کا ہے اور داؤ بھاشا کا۔ ان کے درمیان فارسی اضافت نہیں لگ سکتی۔ جو لوگ دن بدن لکھتے یا بولتے ہیں سخت غلطی کرتے ہیں اور روز بروز کہو یا دن پر دن اسی طرح ہے ...."

اور جب میں سوچتا کہ یہ تو ترکیب نحوی سے بھی خطرناک معاملے میں الجھ گیا ہوں تو جمائی لے کر پیار سے کہتا۔ "داؤ جی اب نیند آ رہی ہے!"

"اور وہ ترکیب نحوی؟" وہ جھٹ سے پوچھتے۔

اس کے بعد میں چاہے لاکھ بہانے کرتا ادھر ادھر کی ہزار باتیں کرتا مگر وہ اپنی کھاٹ پر ایسے ہی بیٹھے رہتے بلکہ اگر ذرا سی دیر ہو جاتی تو کرسی پر رکھی ہوئی پگڑی اٹھا کر سر پر دھر لیتے چنانچہ کچھ بھی ہوتا ان کے ہر سوال کا خاطر خواہ جواب دینا پڑتا۔ ای چند کالج چلا گیا تو اس کی بیٹھک مجھے مل گئی اور داؤ جی کے دل میں اس کی محبت پر بھی قبضہ کر لیا۔ اب مجھے داؤ جی بہت اچھے لگنے لگے تھے لیکن ان کی جو باتیں مجھے اس وقت بری لگتی تھیں وہ اب بھی بری لگتی ہیں بلکہ اب پہلے سے کسی قدر زیادہ' شاید اس لئے کہ اب میں نفسیات کا ایک ہونہار طالب علم ہوں اور داؤ جی پرانے ملائی مکتب کے پروردہ تھے۔ سب سے بری عادت ان کی اٹھتے بیٹھتے سوال پوچھتے رہنے کی تھی اور دوسری کھیل کود سے منع کرنے کی۔ وہ تو بس یہ چاہتے تھے کہ آدمی پڑھتا رہے پڑھتا رہے۔ اور جب اس مدقوق کی موت کا دن قریب آئے تو کتابوں کے ڈھیر پر جان دے دے۔ صحت جسمانی قائم رکھنے کے لئے ان کے پاس بس ایک ہی نسخہ تھا' لمبی سیر اور وہ بھی صبح کی۔ تقریباً روز سورج نکلنے سے کوئی دو گھنٹے پیشتر وہ مجھے بیٹھک میں جگانے آتے اور میرا کندھا ہلا کر کہتے۔ "اٹھ گولو موتا ہو گیا بیٹا۔" دنیا جہاں کے والدین صبح جگانے کے لئے یہ کہا کرتے ہیں کہ اٹھو بیٹا صبح ہو گئی یا سورج نکل آیا مگر وہ "موتا ہو گیا" کہہ کر میری تذلیل کیا کرتے میں منمناتا تو چمکار کر کہتے۔" بھدا ہو جائے گا بیٹا تو گھوڑے پر ضلع کا دورہ کیسے کیا کرے گا۔"

اور میں گرم گرم بستر سے ہاتھ جوڑ کر کہتا۔ "داؤ جی خدا کے لئے مجھے صبح نہ جگاؤ چاہے مجھے قتل کر دو۔ مجھے جان سے مار دو۔"

یہ فقرہ ان کی سب سے بڑی کمزوری تھی وہ فوراً میرے سر پر لحاف ڈال دیتے اور باہر نکل جاتے۔

بے بے کو ان داؤ جی سے اللہ واسطے کا بیر تھا اور داؤ جی ان سے بہت ڈرتے تھے وہ سارا دن محلے والیوں کے کپڑے سیا کرتیں اور داؤ جی کو کوسنے دیے جاتیں۔ ان کی اس زبان درازی پر مجھے بہت غصہ آتا تھا مگر پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر نہ ہو سکتا تھا۔ کبھی کبھار جب وہ ناگفتنی گالیوں پر اتر آتیں تو داؤ جی میرے پاس بیٹھک میں آ جاتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر کرسی پہ بیٹھ جاتے۔ تھوڑی دیر بعد کہتے۔ "غیبت کرنا بڑا گنا ہے۔ لیکن میرا خدا مجھے معاف کرے۔ تیری بے بے بھٹیارن ہے اور اس کی سرائے میں میں میری قرۃ العین اور تھوڑا تھوڑا تو بھی۔ ہم تینوں بڑے عاجز مسافر ہیں۔" اور واقعی بے بھٹیارن سی تھی۔ اس کا رنگ سخت کالا تھا اور دانت بے حد سفید' ماتھا محراب دار اور آنکھیں چنیاں سی۔ چلتی تو ایسی گربہ پائی کے ساتھ جیسے (خدا مجھے بھی معاف کرے) کٹنی کنسوئیاں لیتی پھرتی ہے۔ بیچاری بی بی کو ایسی ایسی بری باتیں کہتی کہ وہ دنوں دن رو رو کر ہلکان ہوا کرتی۔ ایک ای چند کے ساتھ اس کی بنتی تھی۔ شاید اس وجہ سے کہ دونوں ہم شکل تھے یا شاید اس وجہ سے کہ اس کو بی بی کی طرح اپنے داؤ جی سے پیار نہ تھا۔ یوں تو بی بی بیچاری بہت اچھی لگتی تھی مگر اس سے میری بھی نہ بنتی تھی۔ میں کوٹھے پر بیٹھا سوال نکال رہا ہوں۔ داؤ جی نیچے بیٹھے ہیں اور بی بی اوپر برساتی سے ایندھن لینے آئی تو ذرا رک کر مجھے دیکھا پھر منڈیر سے جھانک کر بولی۔

"داؤ جی پڑھ نہیں رہا ہے تنکوں کی چارپائیاں بنا رہا ہے۔"

میں غصیل بچے کی طرح منہ چڑا کر کہتا۔" تجھے کیا' نہیں پڑھتا' تو کیوں بڑ بڑ کرتی ہے ---- آئی بڑی تھانیدارانی۔"

اور داؤ جی نیچے سے ہانک لگا کر کہتے۔ "نہ نہ گولو مولو بہنوں سے نہیں جھگڑا کرتے۔"

اور میں زور سے چلاتا۔ "پڑھ رہا ہوں جی جھوٹ بولتی ہے۔"

داؤ جی آہستہ آہستہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آ جاتے اور کاپیوں کے نیچے نیم پوشیدہ چارپائی دیکھ کر کہتے۔ قرۃ بیٹا تو اس کو چڑایا نہ کر۔ یہ جن بڑی مشکل سے قابو کیا ہے۔ اگر ایک بار پھر بگڑ گیا تو مشکل سے سنبھلے گا۔"

بی بی کہتی "کاپی اٹھا کر دیکھ لو داؤ جی اس کے نیچے ہے وہ چارپائی جس سے کھیل رہا تھا۔"

میں قہر آلود نگاہوں سے بی بی کو دیکھتا اور وہ لکڑیاں اٹھا کر نیچے اتر جاتی۔ پھر داؤ جی سمجھاتے کہ "بی بی یہ سب کچھ تیرے فائدے کے لئے کہتی ہے۔ ورنہ اسے کیا پڑی ہے کہ مجھے بتاتی پھرے۔ تو فیل ہو یا پاس اس کی بلا سے! مگر وہ تیری بھلائی چاہتی ہے تیری بہتری چاہتی ہے۔" اور مجھے داؤ جی کی یہ بات ہرگز سمجھ نہ آتی تھی۔ میری شکایتیں کرنے والی میری بھلائی کیونکہ چاہ سکتی تھی؟

ان دنوں معمول یہ تھا کہ صبح دس بجے سے پہلے داؤ جی کے ہاں سے چل دیتا گھر جا کر ناشتہ کرتا اور پھر سکول پہنچ جاتا۔ آدھی چھٹی پر میرا کھانا سکول بھیج دیا جاتا اور شام کو سکول بند ہونے پر گھر آ کے اپنی لالٹین تیل سے بھرتا اور داؤ جی کے یہاں آ جاتا۔ پھر رات کا کھانا بھی مجھے داؤ جی کے گھر پر ہی بھجوا دیا جاتا۔ جن ایام میں منصفی بند ہوتی داؤ جی سکول کی گراؤنڈ میں آ کر بیٹھ جاتے اور میرا انتظار کرنے لگتے۔ وہاں سے گھر تک سوالات کی بوچھاڑ رہتی۔ سکول میں جو کچھ پڑھایا گیا ہوتا اس کی تفصیل پوچھتے۔ پھر مجھے میرے گھر تک چھوڑ کر خود سیر کو چلے جاتے۔ ہمارے قصبہ میں منصفی کا کام مہینے میں دس دن داؤ جی باقاعدہ کچہری میں گزارتے تھے۔ ایک آدھ عرضی آ جاتی تھی تو دو چار روپے کما لیتے ورنہ فارغ اوقات میں وہاں بھی مطالعہ کا سلسلہ جاری رکھتے۔ بے بے کا کام اچھا تھا اس کی کنٹریبوشن اور محلے والیوں سے جوڑا توڑ اچھے مالی نتائج پیدا کرتی

کہنے لگے "میں کیا تھا اور کیا ہو گیا ---- حضرت مولانا کی پہلی آواز کیا تھی! میری طرف سر مبارک اٹھا کر فرمایا' چوپال زادے ہمارے پاس آؤ' میں لاٹھی ٹیکتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ بعنہ پھماڑ اور دیگر دیہات کے لڑکے نیم دائرہ بنائے ان کے سامنے بیٹھے سبق یاد کر رہے تھے۔ ایک دربار لگا تھا اور کسی کو آنکھ اوپر اٹھانے کی ہمت نہ تھی ---- میں حضور کے قریب گیا تو فرمایا' بھئی ہم تم کو ہر روز یہاں بکریاں چراتے دیکھتے ہیں' انہیں چرنے چگنے کے لئے چھوڑ کر ہمارے پاس آ جایا کرو اور کچھ پڑھ لیا کرو -- ---- پھر حضور نے میری عرض سنے بغیر پوچھا کیا نام ہے تمہارا؟ میں نے گنواروں کی طرح کہا چھو ---- حضرت مسکرائے ---- تھوڑا ہنسے بھی ---- فرمانے لگے پورا نام کیا ہے؟ پھر خود ہی بولے چتت رام ہو گا ---- میں نے سر ہلا دیا ---- حضور کے شاگرد کتاب سے نظریں چرا کر میری طرف دیکھ رہے تھے میرے گلے میں کھدر کا لمبا کرتہ تھا پائجامہ کی بجائے صرف لنگوٹ بندھا تھا۔ پاؤں میں ادھوڑی کے موٹے جوتے اور سر پر سرخ رنگ کا جانگیہ لپیٹا ہوا تھا۔ بکریاں میری ----"
میں نے بات کاٹ کر پوچھا۔ "آپ بکریاں چراتے تھے داؤ جی؟"

"ہاں ہاں" فخر سے بولے "میں گڈریا تھا اور میرے باپ کی بارہ بکریاں تھیں۔" حیرانی سے میرا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا اور میں نے معاملہ کی تہہ تک پہنچنے کے لئے جلدی سے پوچھا۔ "اور آپ سکول کے پاس بکریاں چرایا کرتے تھے۔"

داؤ جی نے کرسی چارپائی کے قریب کھینچ لی اور اپنے پاؤں پائے پر رکھ کر بولے۔ "جان پدر اس زمانے میں تو شہروں میں بھی سکول نہ ہوتے تھے۔ میں گاؤں کی بات کر رہا ہوں۔ آج سے چوہتر برس پہلے بھلا کوئی تمہارے ایم۔بی ہائی سکول کا نام بھی جانتا تھا؟ وہ تو میرے آقا کو پڑھانے کا شوق تھا' ارد گرد کے لوگ اپنے لڑکے چار حرف پڑھنے کو ان کے پاس بھیج دیتے ---- ان کا سارا خاندان زیور علم سے آراستہ اور دینی نعمتوں سے مالا مال تھا۔ والد ان کے ضلع بھر کے ایک ہی حکیم اور چوٹی کے مبلغ تھے۔ جدامجد مہاراجہ کشمیر کے میر منشی' گھر میں علم کے دریا بہتے تھے۔ فارسی عربی' جبرو مقابلہ' اقلیدس' حکمت اور علم ہیئت ان کے گھر کی لونڈیاں تھیں۔ حضور کے والد کو دیکھنا مجھے نصیب نہیں ہوا لیکن آپ کی زبانی ان کے تبحر علمی کی سب داستانیں سنیں۔ شیفتہ اور حکیم مومن خاں مومن سے ان کے بڑے مراسم تھے اور خود حضرت مولانا کی تعلیم دلی میں مفتی آزردہ مرحوم کی نگرانی میں ہوئی تھی ...."

مجھے داؤ جی کے موضوع سے بھٹک جانے کا ڈر تھا اس لئے میں نے جلدی سے پوچھا "پھر آپ نے حضرت مولانا کے پاس پڑھنا شروع کر دیا۔"

"ہاں" داؤ جی اپنے آپ سے باتیں کرنے لگے۔ "ان کی باتیں ہی ایسی تھیں۔ ان کی نگاہیں ہی ایسی تھیں جس کی طرف توجہ فرماتے تھے۔ بندے سے مولا کر دیتے تھے۔ میں تو اسی وقت لاٹھی زمین پر ڈال ان کے پاس بیٹھ گیا۔ فرمایا اپنے بھائیوں کے پاس بوریے پر بیٹھو۔ میں نے کہا جی اٹھارہ برس دھرتی پر بیٹھے گزر گئے۔ اب کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر مسکرا دیے اپنے چوبی صندوقچے سے حروف ابجد کا ایک مقوا نکالا اور بولے الف' بے' پے' تے ---- سبحان اللہ کیا آواز تھی' کس شفقت سے بولے تھے کس لہجے سے فرما رہے تھے الف' بے' پے' تے' اور داؤ جی ان حروفوں کا ورد کرتے ہوئے اپنے ماضی میں کھو گئے۔ تھوڑی دیر بعد انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ اٹھا کر کہا ادھر رہٹ تھا اور اس کے ساتھ مچھلیوں کا حوض۔ پھر انہوں نے بایاں ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا "اور اس طرف مزارعین کے کوٹھے۔ دونوں کے درمیان حضور کا باغیچہ تھا اور سامنے ان کی قدیم عظیم الشان حویلی۔ اسی باغیچے میں ان کا مکتب لگتا تھا۔ درفیض کھلا تھا جس کا جی چاہے آئے نہ مذہب کی قید نہ مسلک کی پابندی ...."

میں نے کافی دیر سوچنے کے بعد باادب باملاحظہ قسم کا فقرہ تیار کر کے پوچھا۔ "حضرت مولانا کا اسم گرامی شریف کیا تھا؟" تو پہلے انہوں نے میرا فقرہ ٹھیک کیا اور پھر بولے "حضرت اسماعیل چشتی رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ان کے والد ہمیشہ انہیں جان جاناں کہہ کر پکارتے تھے۔ کبھی جان جاناں کی رعایت سے مظہر جان جاناں بھی کہہ دیتے تھے۔"
میں ایسی دلچسپ کہانی سننے کا ابھی اور خواہشمند تھا کہ داؤ جی اچانک رک گئے اور بولے۔" سب سڈی ایری سسٹم کیا تھا؟" ان انگریزوں کا برا ہو یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی صورت میں آئیں یا ملکہ وکٹوریہ کا فرمان لے کر' سارے معاملے میں کھنڈت ڈال دیتے ہیں۔ سوا کے پہاڑے کی طرح میں نے سب سڈی ایری سسٹم کا سارا ڈھانچہ ان کی خدمت میں پیش کر دیا۔ پھر انہوں نے میز سے گرائمر اٹھائی اور بولے۔ "باہر جا کر دیکھ کے آ کہ تیری بے بے کا غصہ کم ہوا کہ نہیں۔" میں دوات میں پانی ڈالنے کے بہانے باہر گیا تو بے بے کو مشین چلاتے اور بی بی کو چوکا صاف کرتے پایا۔
داؤ جی کی زندگی میں بے بے والا پہلو بڑا ہی کمزور تھا جب وہ دیکھتے کہ گھر میں مطلع صاف ہے اور بے بے کے چہرے پر کوئی شکن نہیں ہے تو وہ پکار کر کہتے۔ "سب ایک ایک شعر سناؤ۔" پہلے مجھ سے تقاضا ہوتا اور میں چھوٹتے ہی کہتا۔

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

اس پر وہ تالی بجاتے اور کہتے۔ "اولیں شعر نہ سنوں گا' اردو کم سنوں گا اور مسلسل نظم کا ہرگز نہ سنوں گا۔" میں کہتا "مجھے سوچنے دیجئے۔ اتنے میں بی بی سنائے۔"
بی بی بھی میری طرح اکثر اس شعر سے شروع کرتی۔

شنیدم کہ شاپور دم درکشید
چو خسرو برا شمس قلم درکشید

اس پر داؤ جی ایک مرتبہ پھر آرڈر آرڈر پکارتے۔ بی بی قینچی رکھ کر کہتی۔

"شورے شد واز خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی ست شب فتنہ غنودیم۔"

داؤ جی شاباش تو ضرور کہہ دیتے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتے کہ "بیٹا یہ شعر تو کئی مرتبہ سنا چکی ہے۔"

پھر وہ بے بے کی طرف دیکھ کر کہتے۔ "بھئی آج تمہاری بے بے بھی ایک شعر سنائے گی۔" مگر بے بے ایک ہی روکھا سا جواب دیتی۔" مجھے نہیں آتے شیر کمبخت۔" اس پر داؤ جی کہتے گھوڑیاں ہی سنا دے۔ اپنے بیٹوں کے بیاہ کی گھوڑیاں ہی گا دے۔" اس پر بے بے کے ہونٹ مسکرانے کو کرتے لیکن وہ مسکرا نہ سکتی اور داؤ جی عین عورتوں کی طرح گھوڑیاں گانے لگتے۔ ان کے درمیان کبھی امی چند کا اور کبھی میرا نام ٹانک دیتے پھر کہتے۔" میں اپنے اس گولو مولو کی شادی پر سرخ پگڑی باندھوں گا۔ برات میں ڈاکٹر صاحب کے ساتھ ساتھ چلوں گا اور نکاح نامہ پر شہادت کے دستخط کروں گا۔" میں دستور کے مطابق شرما کر نگاہیں نیچی کر لیتا۔ تو وہ کہتے۔" پتہ نہیں اس ملک کے کسی شہر میں میری چھوٹی سی بہو پانچویں یا چھٹی جماعت میں پڑھ رہی ہو گی۔ ہفتہ میں ایک دن لڑکیوں کی خانہ داری ہوتی ہے۔ اس نے تو بہت سی چیزیں پکانی سیکھ لی ہوں گی۔ پڑھنے میں بھی ہوشیار ہو گی۔ اس بدھو کو تو یہ یاد نہیں رہتا کہ مادیاں گھوڑی ہوتی ہے یا مرغی۔ وہ تو فر فر سب کچھ سناتی ہو گی۔ میں تو اس کو فارسی پڑھاؤں گا۔ پہلے اس کو خطاطی کی تعلیم دوں گا پھر خط شکستہ سکھاؤں گا۔ مستورات کو خط شکستہ نہیں آتا۔ میں تو اپنی بہو کو سکھا دوں گا۔

---- سن گولو! پھر میں تیرے ہی پاس رہوں گا میں اور میری بہو فارسی میں باتیں کریں گے۔ وہ بات بات پر بقرمائید کہے گی اور تو احمقوں کی طرح منہ دیکھا کرے گا۔"

پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے خیلے خیلے خوب کہتے۔ جان پدر چرا ایں قدر زحمت می کشی .... خوب .... یاددارم .... اور پتہ نہیں کیا کچھ کہتے۔ بچارے داؤ جی! چٹائی پر اپنی چھوٹی سی دنیا بسا کر اس میں فارسی کے فرمان جاری کیے جاتے ایک دن جب چھت پر دھوپ میں بیٹھے ہوئے وہ ایسی ہی دنیا بسا چکے تھے تو ہولے سے مجھے کہنے لگے۔ "جس طرح خدا نے تجھے ایک نیک سیرت بیوی اور مجھے سعادت مند بہو عطا کی ہے ویسے ہی وہ اپنے فضل سے میرے ای چند کو بھی دے۔ اس کے خیالات مجھے اچھے نہیں لگتے۔ یہ سیواسنگ یہ مسلم لیگ یہ بلیچ پارٹیاں مجھے پسند نہیں اور ای چند لاٹھی چلانا گتکا کھیلنا سیکھ رہا ہے۔ میری تو وہ کب مانے گا۔ ہاں خدائے بزرگ و برتر اس کو ایک نیک مومن سی بیوی دلا دے تو وہ اسے راہ راست پر لے آئے گی۔"

اس مومن کے لفظ پر مجھے بہت تکلیف ہوئی اور میں چپ سا ہو گیا۔ چپ محض اس لیے ہوا تھا کہ اگر میں نے منہ کھولا تو یقیناً ایسی بات نکلے گی جس سے داؤ جی کو بڑا دکھ ہو گا---- میری اور ای چند کی تو خیر باتیں ہی تھیں لیکن 12 جنوری کو بی بی کی برات بچ آ گئی۔ جیجاجی رام پرتاب کے بارے میں داؤ جی مجھے بہت کچھ بتا چکے تھے کہ وہ بہت اچھا لڑکا ہے اور اس شادی کے بارے میں انہوں نے جو استخارہ کیا تھا اس پر وہ پورا اترا ہے۔ سب سے زیادہ خوشی داؤ جی کو اس بات کی تھی کہ ان کے سمدھی فارسی کے استاد تھے اور کبیر پنتھی مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ بارہ تاریخ کی شام کو جب بی بی وداع ہونے لگی تو گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ بے بے زار و قطار رو رہی ہے۔ ای چند آنسو بہا رہا ہے اور محلے کی عورتیں پھس پھس کر رہی ہیں۔ میں دیوار کے ساتھ لگا کھڑا ہوں اور داؤ جی میرے کندھوں پر ہاتھ رکھے کھڑے ہیں اور بار بار کہہ رہے ہیں۔" آج زمین کچھ میرے پاؤں نہیں پکڑتی میں توازن قائم نہیں رکھ سکتا۔" جیجا جی کے باپ بولے۔" منشی جی اب ہمیں اجازت دیجئے۔" تو بی بی پچھاڑ کھا کر گر پڑی۔ اسے چارپائی پر ڈالا۔ عورتیں ہوا کرنے لگیں اور داؤ جی میرا سہارا لے کر اس کی چارپائی کی طرف چلے۔ انہوں نے بی بی کو کندھے سے پکڑ کر اٹھایا اور کہا "یہ کیا ہوا بیٹا' اٹھو! یہ تو تمہاری نئی اور خود مختار زندگی کی پہلی گھڑی ہے۔ اسے یوں منحوس نہ بناؤ۔" بی بی اسی طرح دھاڑیں مارتے ہوئے داؤ جی سے لپٹ گئی۔ انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "قرے العین میں تیرا گنہگار ہوں کہ تجھے پڑھا نہ سکا۔ تیرے سامنے شرمندہ ہوں کہ تجھے علم کا جہیز نہ دے سکا۔ تو مجھے معاف کر دے گی اور شاید برخور دار رام پرتاب بھی لیکن میں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکوں گا۔ میں خطا کار ہوں اور میرا خجل سر تیرے سامنے خم ہے۔" یہ سن کر بی بی اور بھی زور زور سے رونے لگی اور داؤ جی کی آنکھوں سے کتنے سارے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے ٹوٹ کر زمین پر گرے۔ ان کے سمدھی نے آگے بڑھ کر کہا۔ "منشی جی آپ فکر نہ کریں بیٹی کو میں کریما پڑھا دوں گا۔" داؤ جی ادھر پلٹے اور ہاتھ جوڑ کر بولے "کریما تو پڑھ چکی ہے گلستان بوستاں بھی ختم کرا چکا ہوں لیکن میری حسرت پوری نہیں ہوئی۔" اس پر وہ ہنس کر بولے۔ "آپ بھی حد کرتے ہیں ساری گلستاں تو میں نے بھی نہیں پڑھی جہاں عربی آتی تھی آگے گزر جاتا تھا۔"

داؤ جی اسی طرح ہاتھ جوڑے کتنی دیر خاموش کھڑے رہے۔ بی بی نے گوٹہ لگی سرخ رنگ کی ریشمی چادر سے ہاتھ نکال کر پہلے ای چند کے اور پھر میرے سر پر پھیرا اور سکھیوں کے بازوؤں میں ڈیوڑھی کی طرف چل دی ۔ داؤ جی میرا سہارا لے کر چلے تو انہوں نے مجھے اپنے ساتھ زور سے بھینچ کر کہا۔ "لو یہ بھی رو رہا ہے۔ دیکھو یہ ہمارا سہارا بنا پھرتا ہے۔ او گولو ... اومر دم دیدہ ... تجھے کیا ہو گیا ... جان پدر تو کیوں ...؟"

اس پر ان کا گلا رندھ گیا اور میرے آنسو بھی تیز ہو گئے۔ برات والے تانگوں اور اکوں پر سوار تھے۔ بی بی رتھ میں جا رہی تھی اور اس کے پیچھے ای چند اور میں اور ہمارے درمیان داؤ جی پیدل چل رہے تھے۔ اگر بی بی کی چیخ ذرا زور سے نکل جاتی تو داؤ جی آگے بڑھ کر رتھ کا پردہ اٹھاتے اور کہتے۔" لاحول پڑھو بیٹا۔ لاحول پڑھو۔" اور خود آنکھوں پر رکھے ان کی پگڑی کا شملہ بھیگ گیا تھا!

رانو ہمارے محلے کا بڑا ہی کثیف سا انسان تھا۔ بدی اور کینہ پروری اس کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ وہ باڑہ جس کا میں نے ذکر کیا ہے اسی کا تھا اس میں بیس پچیس بکریاں اور دو گائیں تھیں جن کا دودھ صبح و شام رانو گلی کے بغلی میدان میں بیٹھ کر بیچا کرتا۔ تقریباً سارے محلے والے اسی سے دودھ لیتے تھے اور اس کی شرارتوں کی وجہ سے دبتے بھی تھے۔ ہمارے گھر کے آگے سے گزرتے ہوئے وہ یونہی شوقیہ لاٹھی زمین پر بجا کر داؤ جی کو "پنڈتا جے رام جی کی۔" کہہ کر سلام کیا کرتا۔ داؤ جی نے اسے کئی مرتبہ سمجھایا بھی کہ وہ پنڈت نہیں ہیں معمولی آدمی ہیں کیونکہ پنڈت ان کے نزدیک پڑھے لکھے اور فاضل آدمی کو کہا جا سکتا تھا' لیکن رانو نہیں مانتا تھا۔ وہ اپنی مونچھ چبا کر کہتا۔ "لے بھئی جس کے سر پر بودی (چٹیا) ہو وہ پنڈت ہی ہوتا ہے۔" ---- چوروں یاروں سے اس کی آشنائی تھی۔ شام کو اس کے باڑے میں جوا بھی ہوتا اور گندی اور فحش بولیوں کا مشاعرہ بھی۔ بی بی کے جانے کے بعد ایک دن جب میں اس سے دودھ لینے گیا تو اس نے شرارت سے آنکھ میچ کر کہا۔ "مورنی تو چلی گئی بابو اب تو اس گھر میں رہ کر کیا لے گا۔" میں چپ رہا تو اس نے جاگ والے دودھ میں ڈبہ پھیرتے ہوئے کہا۔ "گھر میں گنگا بہتی تھی سچ بتا غوطہ لگایا کہ نہیں۔" مجھے اس بات پر غصہ آ گیا اور میں نے تاملوٹ گھما کر اس کے سر پر دے مارا۔ اس ضرب شدید سے خون وغیرہ تو برآمد نہ ہوا لیکن وہ چکرا کر تخت پر گر پڑا اور میں گھر بھاگ گیا۔ داؤ کو سارا واقعہ سنا کر میں دوڑا دوڑا اپنے گھر گیا اور ابا جی سے ساری حکایت بیان کی۔ ان کی بدولت رانو کی تھانہ میں طلبی ہوئی اور حوالدار صاحب نے ہلکی سی گوشمالی کے بعد اسے سخت تنبیہہ کر کے چھوڑ دیا۔ اس دن کے بعد سے رانو داؤ جی پر آتے جاتے طرح طرح کے فقرے کسنے لگا۔ وہ سب سے زیادہ مذاق ان کی بودی کا اڑایا کرتا تھا اور واقعی داؤ جی کے فاضل سر پر وہ چپٹی سی بودی ذرا بھی اچھی نہ لگتی تھی مگر وہ کہتے تھے۔ "یہ میری مرحوم ماں کی نشانی ہے اور مجھے زندگی کی طرح عزیز ہے۔ وہ اپنی آغوش میں میرا سر رکھ کے اسے دہی سے دھوتی تھی اور کڑوا تیل لگا کر چمکاتی تھی گو میں نے حضرت مولانا کے سامنے کبھی بھی پگڑی اتارنے کی جسارت نہیں کی لیکن وہ جانتے تھے اور جب میں دیال چند میموریل ہائی سکول سے ایک سال کی ملازمت کے بعد چھٹیوں میں گاؤں آیا تو حضور نے پوچھا "شہر جا کر چوٹی تو نہیں کٹوا دی؟" تو میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس پر بہت خوش ہوئے اور فرمایا تم سا سعادت مند بیٹا کم ماؤں کو نصیب ہوتا ہے اور ہم سا خوش قسمت استاد بھی خال خال ہو گا جسے تم ایسے شاگردوں کو پڑھانے کا فخر حاصل ہوا ہو میں نے ان کے پاؤں چھو کر کہا۔ "حضور آپ مجھے شرمندہ کرتے ہیں یہ سب آپ کے قدموں کی برکت ہے۔" ہنس کر فرمانے لگے۔ "چنت رام ہمارے پاؤں نہ چھوا کرو بھلا ایسے لمس سے کیا فائدہ جس کا ہمیں احساس نہ ہو۔ میری آنکھوں سے آنسو آ گئے میں نے کہا "اگر کوئی مجھے بتا دے تو سمندر پھاڑ کر بھی آپ کے لئے دوائی نکال لاؤں اپنی زندگی کی حرارت حضور کی ٹانگوں کے لئے نذر

تھا اور انہیں بہت کوفت ہوئی تھی۔ مجھے سونے کی تاکید کر کے وہ اپنے کمرے میں چلے گئے تو میں کاپی پنسل لے کر پھر بیٹھ گیا اور رات کے ڈیڑھ بجے تک لکھ لکھ کر رٹا لگاتا رہا۔ مگر جب کتاب بند کر کے لکھنے لگتا تو چند فقروں کے بعد اٹک جاتا۔ مجھے داؤ جی کا مایوس چہرہ یاد کر کے اور اپنی حالت کا اندازہ کر کے رونا آ گیا اور میں باہر صحن میں آ کر سیڑھیوں پر بیٹھ کے بیچ بیچ رونے لگا۔ گھٹنوں پر سر رکھ کے رو رہا تھا اور سردی کی شدت سے کانپ رہا تھا۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے کوئی گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گزر گیا تو میں نے داؤ جی کی عزت بچانے کے لئے یہی ترکیب سوچی کہ ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر نکل جاؤں اور پھر واپس نہ آؤں جب فیصلہ کر چکا اور عملی قدم آگے بڑھانے کے لئے سر اوپر اٹھایا تو داؤ جی کمبل اوڑھے میرے پاس کھڑے تھے۔ انہوں نے مجھے بڑے پیار سے اپنے ساتھ لگایا تو سسکیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ صحن میں پھیل گیا۔ داؤ جی نے میرا سر چوم کر کہا۔ "لے بھائی طنبورے میں تو یوں نہ سمجھتا تھا تو تو بہت ہی کم ہمت نکلا۔" پھر انہوں نے مجھے اپنے ساتھ کمبل میں لپیٹ لیا اور بیٹھک میں لے گئے۔ بستر میں بٹھا کر انہوں نے میرے چاروں طرف رضائی لپیٹی اور خود پاؤں اوپر کر کے کرسی پر بیٹھ گئے۔

انہوں نے کہا اقلیدس چیز ہی ایسی ہے تو اس کے ہاتھوں یوں نالاں ہے۔ میں اس سے اور طرح تنگ ہوا تھا۔ حضرت مولانا کے پاس جبر و مقابلہ اور اقلیدس کی جس قدر کتابیں تھیں انہیں میں اچھی طرح سے پڑھ کر اپنی کاپیوں پر اتار چکا تھا کوئی بات ایسی نہ تھی جس میں الجھن ہوتی۔ میں نے یہ جانا کہ ریاضی کا ماہر ہو گیا ہوں لیکن ایک رات میں اپنی کھاٹ پر پڑا اقساوی الساقین کے ایک مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ بات الجھ گئی۔ میں نے دیا جلا کر شکل بنائی اور اس پر غور کرنے لگا جبر و مقابلہ کی رو سے مفروضہ کا جواب ٹھیک آتا تھا لیکن علم ہندسہ سے پائیہ ثبوت کو نہ پہنچتا تھا۔ میں ساری رات کاغذ سیاہ کرتا رہا لیکن تیری طرح سے رویا نہیں۔ علی الصبح میں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے اپنے دست مبارک سے کاغذ پر شکل کھینچ کر سمجھنا شروع کیا لیکن جہاں مجھے الجھن ہوئی تھی۔ وہیں حضرت مولانا کی طبع رسا کو بھی کوفت ہوئی۔ فرمانے لگے۔ "چنت رام اب ہم تم کو نہیں پڑھا سکتے۔ جب استاد اور شاگرد کا علم ایک سا ہو جائے تو شاگرد کو کسی اور معلم کی طرف رجوع کرنا چاہئے۔" میں نے جرات کر کے کہہ دیا کہ حضور اگر کوئی اور یہ جملہ کہتا تو میں اسے کفر کے مترادف سمجھتا لیکن آپ کا ہر حرف اور ہر شوشہ میرے لیے حکم ربانی سے کم نہیں اس لئے خاموش ہوں۔ بھلا آقائے غزنوی کے سامنے ایاز کی کیا مجال! لیکن حضور مجھے دکھ بہت ہوا ہے۔ فرمانے لگے "تم بے حد جذباتی آدمی ہو۔ بات تو سن لی ہوتی۔" میں نے سر جھکا کر کہا۔ "ارشاد" فرمایا۔ "دلی میں حکیم ناصر علی سیستانی علم ہندسہ کے بڑے ماہر ہیں اگر تم کو اس کا ایسا ہی شوق ہے تو ان کے پاس چلے جاؤ اور اکتساب علم کرو۔ ہم ان کے نام رقعہ لکھ دیں گے۔ میں نے رضامندی ظاہر کی تو فرمایا اپنی والدہ سے پوچھ لینا اگر وہ رضامند ہوں تو ہمارے پاس آنا ---۔ والدہ مرحومہ سے پوچھتا اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق جواب پاتا۔ انہونی بات تھی چنانچہ میں نے ان سے نہیں پوچھا۔ حضور پوچھتے تو میں دروغ بیانی سے کام لیتا کہ گھر کی لپائی پتائی کر رہا ہوں جب فارغ ہوں گا تو والدہ سے عرض کروں گا۔ چند ایام بڑے اضطرار کی حالت میں گزرے۔ میں دن رات اس مشکل کو حل کرنے کی کوشش کرتا مگر صحیح جواب برآمد نہ ہوتا۔ اس لاینحل مسئلہ سے طبیعت میں اور انتشار پیدا ہوا۔ میں دلی جانا چاہتا تھا لیکن حضور سے اجازت نہ مل سکتی تھی نہ رقعہ۔ وہ والدہ کی رضامندی کے بغیر اجازت دینے والے نہ تھے اور والدہ اس بڑھاپے میں کیسے آمادہ ہو سکتی تھیں۔ ایک رات جب سارا گاؤں سو رہا تھا اور میں تیری طرح پریشان تھا تو میں نے اپنی والدہ کی پٹاری سے اس کی کل پونجی سے دو روپے چرا لیے اور نصف اس کے لئے چھوڑ کر گاؤں سے نکل گیا۔ خدا مجھے معاف کرے اور میرے دونوں بزرگوں کی روحوں کو مجھ پر مہربان رکھے واقعی میں نے بڑا گناہ کیا اور ابد تک میرا سر ان دونوں کرم فرماؤں کے سامنے ندامت سے جھکا رہے گا ---۔ گاؤں سے نکل کر میں حضور کی حویلی کے پیچھے ان کے مسند کے پاس پہنچا جہاں بیٹھ کر آپ پڑھاتے تھے۔ گھٹنوں کے بل ہو کر میں نے زمین کو بوسہ دیا اور دل میں کہا' بدقسمت ہوں' بے اجازت جا رہا ہوں لیکن آپ کی دعاؤں کا عمر بھر محتاج رہوں گا۔ میرا قصور معاف نہ کیا تو آپ کے قدموں میں جان دے دوں گا۔ اتنا کہہ کر اور لاٹھی کندھے پر رکھ میں وہاں سے چل دیا ---۔ سن رہا ہے؟" داؤ جی نے میری طرف غور سے دیکھ کر پوچھا۔

رضائی کے بیچ خارپشت بنے میں نے آنکھیں جھپکائیں اور ہولے سے کہا جی؟"

داؤ جی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "قدرت نے میری کمال مدد کی۔ ان دنوں جاکھل جنید سرسہ حصار والی ریل کی پٹڑی بن رہی تھی۔ یہی سیدھا راستہ دلی کو جاتا تھا اور یہیں مزدوری ملتی تھی۔ ایک دن میں مزدوری کرتا اور دو دن چلتا۔ اس طرح تائید غیبی کے سہارے سولہ دن میں میں دلی پہنچ گیا۔ منزل مقصود تو ہاتھ آ گئی تھی' لیکن گوہر مقصود کا سراغ نہ ملتا تھا جس کسی سے پوچھتا حکیم ناصر علی سیستانی کا دولت خانہ کہاں ہے نفی میں جواب ملتا۔ دو دن ان کی تلاش جاری رہی تھیں لیکن پتہ نہ پا سکا۔ قسمت یاور تھی صحت اچھی تھی۔ انگریزوں کے لئے نئی کوٹھیاں بن رہی تھیں وہاں کام پر جانے لگا۔ شام کو فارغ ہو کر حکیم صاحب کا پتہ معلوم کرتا اور رات کے وقت ایک دھرم شالہ میں کھیس پھینک کر گہری نیند سو جاتا۔ مثل مشہور ہے جویندہ یابندہ! آخر ایک دن مجھے حکیم صاحب کی جائے رہائش معلوم ہو گئی۔ وہ پھر پھوڑوں کے محلے کی ایک تیرہ و تار گلی میں رہتے تھے۔ شام کے وقت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں فروکش تھے اور چند دوستوں سے اونچے اونچے گفتگو ہو رہی تھی۔ میں جوتے اتار کر دہلیز کے اندر کھڑا ہو گیا۔ ایک صاحب نے پوچھا۔ "کون ہے؟"

میں نے سلام کر کے کہا "حکیم صاحب سے ملنا ہے۔" حکیم صاحب دوستوں کے حلقہ میں سر جھکائے بیٹھے تھے اور ان کی پشت میری طرف تھی۔ اسی طرح بیٹھے بیٹھے بولے "اسم گرامی" میں نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "پنجاب سے آیا ہوں اور .... میں بات پوری بھی نہ کر پایا تھا کہ زور سے بولے۔ "اوہو! چنت رام ہو؟" میں کچھ جواب نہ دے سکا فرمانے لگے مجھے اسماعیل کا خط ملا ہے لکھتا ہے شاید چنت رام تمہارے پاس آئے ہمیں بتائے بغیر گھر سے فرار ہو گیا ہے اس کی مدد کرنا۔ میں اسی طرح خاموش کھڑا رہا تو پاٹ دار آواز میں بولے۔ میاں اندر آ جاؤ کیا چپ کا روزہ رکھا ہے؟" میں ذرا آگے بڑھا تو بھی میری طرف نہ دیکھا اور ویسے ہی عروس نو کی طرح بیٹھے رہے۔ پھر قدرے تحکمانہ انداز میں کہا۔ "برخوردار بیٹھ جاؤ۔ میں وہیں بیٹھ گیا تو اپنے دوستوں سے فرمایا۔ "بھئی ذرا ٹھہرو مجھے اس سے دو دو ہاتھ کر لینے دو۔ پھر حکم ہوا بتاؤ ہندسہ کا کون سا مسئلہ تمہاری سمجھ میں نہیں آیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا تو انہوں نے اسی طرح کندھوں کی طرف اپنے ہاتھ بڑھائے اور آہستہ آہستہ کرتہ یوں اوپر کھینچ لیا کہ ان کی کمر برہنہ ہو گئی۔ پھر فرمایا۔ "بتاؤ اپنی انگلی سے میری کمر پر متساوی الساقین" مجھ پر سکتہ کا عالم طاری تھا نہ آگے بڑھنے کی ہمت تھی نہ پیچھے ہٹنے کی طاقت۔ ایک لمحہ کے بعد بولے۔ "میاں جلدی کرو' نابینا ہوں' کاغذ قلم کچھ نہیں سمجھتا۔ میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور ان کی چوڑی چکلی کمر پر کانپتے ہوئے انگلی سے متساوی الساقین بنانے لگا جب وہ غیر مرئی شکل بن چکی تو بولے اب نقطہ س سے خط ج پر عمود گراؤ ایک تو میں گھبرایا ہوا تھا دوسرے وہاں کچھ نظر نہ آتا تھا۔ یونہی انگل سے میں نے ایک مقام پر انگلی رکھ

کر عمود گرانا چاہا تو تیزی سے بولے ہے ہے کیا کرتے ہو یہ نقطہ س ہے کیا؟ پھر خود ہی بولے آہستہ آہستہ عادی ہو جاؤ گے۔ بائیں کندھے سے کوئی چھ انگل نیچے نقطہ س ہے وہاں سے خط کھینچو ــــــ اللہ اکبر اللہ اکبر کیا علم تھا کیا آواز تھی اور کیسی تیز فہم تھی۔ وہ بول رہے تھے اور میں مبہوت بیٹھا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ ابھی ان کے آخری جملے کے ساتھ نور کی لکیریں متساوی الساقین بن کر ان کی کمر پر ابھر آئیں گی۔" پھر داؤ جی دلی کے دنوں میں ڈوب گئے۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ وہ میری طرف دیکھ رہے تھے لیکن مجھے نہیں دیکھ رہے تھے۔ میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔ پھر کیا ہوا داؤ جی؟" انہوں نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "رات بہت گزر چکی ہے اب تو سو جا پھر بتاؤں گا۔" میں ضدی بچے کی طرح ان کے پیچھے پڑ گیا تو انہوں نے کہا "پہلے وعدہ کر کہ آئندہ مایوس نہیں ہو گا اور ان چھوٹی چھوٹی پر اپوزیشنوں کو بتاشے سمجھے گا۔" میں نے جواب دیا۔ "حلوا سمجھوں گا آپ فکر نہ کریں۔" انہوں نے کھڑے کھڑے کمبل لپیٹتے ہوئے کہا۔ "بس مختصر یہ کہ میں ایک سال حکیم صاحب کی حضوری میں رہا اور اس بحر علم سے چند قطرے حاصل کر کے اپنی کور آنکھوں کو دھویا۔ واپسی پر میں سیدھا اپنے آقا کی خدمت میں پہنچا اور ان کے قدموں پر سر رکھ دیا۔ فرمانے لگے چنت رام اگر ہم میں قوت ہو تو ان پاؤں کو کھینچ لیں' اس پر میں رو دیا تو دست محبت میرے سر پر ہاتھ پر پھیر کر کہنے لگے' ہم تم سے ناراض نہیں ہیں لیکن ایک سال کی فرقت بہت طویل ہے۔ آئندہ کہیں جانا تو ہمیں بھی ساتھ لے جانا۔"

یہ کہتے ہوئے داؤ جی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور وہ مجھے اسی طرح گم سم چھوڑ کر بیٹھک سے باہر نکل گئے۔

امتحان کی قربت سے میرا خون خشک ہو رہا تھا لیکن جسم پھول رہا تھا۔ داؤ جی کو میرے موٹاپے کی فکر رہنے لگی۔ اکثر میرے تھن متھنے ہاتھ پکڑ کر کہتے۔ "اسپ تازی بن طویلہ خرنہ بن۔" مجھے ان کا یہ فقرہ بہت ناگوار گزرتا اور میں احتجاجاً ان سے کلام بند کر دیتا۔ میرے مسلسل مرن برت نے بھی ان پر کوئی اثر نہ کیا اور ان کی فکر اندیشہ کی حد تک پہنچ گئی۔ ایک صبح سیر کو جانے سے پہلے انہوں نے مجھے آ جگایا اور میری منتوں، خوشامدوں، گالیوں اور جھڑکیوں کے باوجود بستر سے اٹھا کوٹ پہنا کر کھڑا کر دیا پھر وہ مجھے بازو سے پکڑ کر گویا گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے۔ سردیوں کی صبح کوئی چار کا عمل۔ گلی میں نہ آدم نہ آدم زاد، تاریکی سے کچھ بھی دکھائی نہ دیتا تھا اور داؤ جی مجھے اسی طرح سیر کو لے جا رہے تھے۔ میں کچھ بک رہا تھا اور وہ کہہ رہے تھے۔ "ابھی گراں خوابی دور نہیں ہوئی ابھی طنبورہ بڑ بڑا رہا ہے۔" تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد کہتے "کوئی سر نکال طنبور سے کسی آہنگ پہ بج یہ کیا کر رہا ہے؟" جب ہم بستی سے بہت دور نکل گئے اور صبح کی یخ ہوا نے میری آنکھوں کو زبردستی کھول دیا تو داؤ جی نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ سرداروں کا رہٹ آیا اور نکل گیا۔ ندی آئی اور پیچھے رہ گئی۔ قبرستان گزر گیا مگر داؤ جی تھے کہ کچھ آیتیں سی پڑھتے چلے جا رہے تھے۔ جب تبہ پر پہنچے تو میری روح فنا ہو گئی۔ یہاں سے لوگ دوپہر کے وقت بھی نہ گزرتے تھے کیونکہ پرانے زمانے میں یہاں ایک شہر غرق ہوا تھا۔ مرنے والوں کی روحیں اس ٹیلے پر رہتی تھیں اور آنے جانے والوں کا کلیجہ چبا جاتی تھیں۔ میں خوف سے کانپنے لگا تو داؤ جی نے میرے گلے کے گرد مفلر اچھی طرح لپیٹ کر کہا کہ سامنے ان دو کیکروں کے درمیان اپنی پوری رفتار سے دس چکر لگاؤ، پھر سو لمبی سانسیں کھینچو اور چھوڑو، تب میرے پاس آؤ میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ میں تبہ سے جان بچانے کے لیے سیدھا ان کیکروں کی طرف روانہ ہو گیا۔ پہلے ایک بڑے ڈھیلے پر بیٹھ کر آرام کیا اور ساتھ ہی حساب لگایا کہ چھ چکروں کا وقت گزر چکا ہو گا اس کے بعد آہستہ آہستہ اونٹ کی طرح کیکروں کے درمیان دوڑنے لگا اور جب دس یعنی چار چکر پورے ہو گئے تو پھر اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر لمبی لمبی سانسیں کھینچنے لگا۔ ایک تو درختوں پر عجیب و غریب قسم کے جانور بولنے لگے تھے دوسرے میری پسلی میں بلا کا درد شروع ہو گیا تھا۔ یہی مناسب سمجھا کہ تبہ پر جا کر داؤ جی کو سوئے ہوئے اٹھاؤں اور گھر لے جا کر خوب خاطر کروں۔ غصہ سے بھرا اور وحشت سے لرزتا میں ٹیلے کے پاس پہنچا۔ داؤ جی تبہ کی ٹھیکریوں پر گھٹنوں کے بل گرے ہوئے دیوانوں کی طرح سر مار رہے تھے اور اونچے اونچے اپنا محبوب شعر گا رہے تھے۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر
بہ پیش عاشقاں شرمندہ باشی!

کبھی دونوں ہتھیلیاں زور سے زمین پر مارتے اور سر اوپر اٹھا کر انگشت شہادت فضا میں یوں ہلاتے جیسے کوئی ان کے سامنے کھڑا ہو اور اس سے کہہ رہے ہوں دیکھ لو، سوچ لو میں تمہیں .... میں تمہیں بتا رہا ہوں .... سنا رہا ہوں .... ایک دھمکی دیے جاتے تھے۔ پھر تڑپ کر ٹھیکریوں پر گرتے اور جفا کم کن جفا کم کن کہتے ہوئے رونے لگتے۔ تھوڑی دیر میں ساکت و جامد وہاں کھڑا رہا اور پھر زور سے چیخ مار کر بجائے قصبہ کی طرف بھاگنے کے پھر کیکروں کی طرف دوڑ گیا۔ داؤ جی ضرور اسم اعظم جانتے تھے اور وہ جن قابو کر رہے تھے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے ایک جن ان کے سامنے کھڑا دیکھا تھا۔ بالکل الف لیلہ، باتصویر والا جن تھا۔ جب داؤ جی کا طلسم اس پر نہ چل سکا تو اس نے انہیں نیچے گرا لیا تھا۔ وہ چیخ رہے۔ تھے جفا کم کن جفا کم کن مگر وہ چھوڑتا نہیں تھا۔ میں اسی ڈھیلے پر بیٹھ کر رونے لگا تھوڑی دیر بعد داؤ جی آئے۔ انہوں نے پہلے جیسا چہرہ بنا کر کہا "چل طنبورے" اور میں ڈرتا ڈرتا ان کے پیچھے ہو لیا۔ راستہ میں انہوں نے گلے میں لٹکتی ہوئی کھلی پگڑی کے دونوں کونے ہاتھ میں پکڑ لیے اور جھوم جھوم کر گانے لگے۔

تیرے لے لے وال فریدا ٹریا ٹریا جا!

اس جادوگر کے پیچھے چلتے ہوئے میں نے ان آنکھوں سے واقعی انہیں دیکھا کہ اس کا سر تبدیل ہو گیا اس کی لمبی لمبی زلفیں کندھوں پر جھولنے لگیں اور اس کا سارا وجود جٹا دھاری ہو گیا ---۔ اس کے بعد چاہے کوئی میری بوٹی بوٹی اڑا دیتا میں ان کے ساتھ سیر کو نہ گیا۔

اس واقعہ کے چند ہی دن بعد کا قصہ ہے کہ ہمارے گھر میں مٹی کے بڑے بڑے ڈھیلے اور اینٹوں کے ٹکڑے آ کر گرنے لگے۔ بے بے نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ بچوں والی کتیا کی طرح داؤ جی سے چمٹ گئی۔ سچ مچ ان سے لپٹ گئی اور انہیں دھکا دے کر زمین پر گرا دیا۔ وہ چلا رہی تھی۔ "بڈھے ٹونگی یہ سب تیرے منتر ہیں یہ سب تیری فارسی ہے۔ تیرا کالا علم ہے جو الٹا ہمارے سر پر آ گیا ہے۔ تیرے پریت میرے گھر میں اینٹیں پھینکتے ہیں اجازت مانگتے ہیں، موت چاہتے ہیں۔" پھر وہ زور زور سے چیخنے لگی۔ میں مرگئی، میں جل گئی لوگو اس بڈھے نے میرے اسی چند کی جان لینے کا پربند کیا ہے۔ مجھ پر جادو کیا ہے، میرا انگ انگ توڑ دیا ہے۔" اسی چند تو داؤ جی کو اپنی زندگی کی طرح عزیز تھا اور اس کی جان کے دشمن بھلا وہ کیونکر ہو سکتے تھے لیکن چنو کی خشت باری انہی کی وجہ سے عمل میں آئی تھی جب میں نے بھی بے بے کی تائید کی تو داؤ جی نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے جھڑک کر کہا "تو احمق ہے اور تیری بے بے ام الجاہلین --- میری ایک سال کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ تو جنوں بھوتوں میں اعتقاد کرنے لگا۔ افسوس تو نے مجھے مایوس کر دیا۔ اے وائے کہ تو شعور کے بجائے عورتوں کے اعتقاد کا غلام نکلا۔ افسوس ---- صد افسوس" بے بے کو اسی طرح چلاتے اور داؤ جی کو یوں کراہتے چھوڑ کر میں اوپر کوٹھے پر دھوپ میں جا بیٹھا ----۔ اسی دن شام کو جب میں اپنے گھر سے آ رہا تھا تو راستہ میں رانو نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ کانی کر کے پوچھا۔ "سنا بابو تیرے تو کوئی اینٹ ڈھیلا تو نہیں لگا؟ سنا ہے تمہارے پنڈت کے گھر میں روڑے گرتے ہیں۔" میں نے اس کمینے کے منہ لگنا پسند نہ کیا اور چپ چاپ ڈیوڑھی میں داخل ہو گیا۔ رات کے وقت داؤ جی مجھ سے جیومیٹری کی پراپوزیشنیں سنتے ہوئے پوچھنے لگے۔ "بیٹا کیا تم سچ مچ جن بھوت یا پری چڑیل کو کوئی مخلوق سمجھتے ہو؟" میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ ہنس پڑے اور بولے۔ "واقعی تو بہت بھولا ہے میں نے آج خواہ مخواہ تجھے جھڑک دیا۔ بھلا تو نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا کہ جن ہوتے ہیں اور اس طرح سے اینٹیں پھینک سکتے ہیں ہم نے جو ولی مستری اور جمے مزدور کو لگا کر برساتی بنوائی ہے وہ تیرے کسی جن کو کہہ کر بنوا لیتے لیکن یہ بتا کہ جن صرف اینٹیں پھینکنے ہی کا کام کرتے ہیں کہ چنائی بھی جانتے ہیں؟" میں نے جل کر کہا۔ "جتنے مذاق چاہو کر لو مگر جس دن سر پھٹے گا اس دن پتہ چلے گا داؤ۔" داؤ جی نے کہا "تیرے جن کی پھینکی ہوئی اینٹ سے تو تاقیامت سر نہیں پھٹ سکتا اس لیے کہ نہ وہ ہے نہ اس سے اینٹ اٹھائی جا سکے گی اور نہ میرے تیرے یا تیری بے بے کے سر میں لگے گی۔"
پھر بولے "سن! علم طبعی کا موٹا اصول ہے کہ کوئی مادی شے کسی غیر مادی وجود سے حرکت میں نہیں لائی جا سکتی---- سمجھ گیا؟"
"سمجھ گیا" میں نے چڑ کر کہا۔
ہمارے قصبہ میں ہائی سکول ضرور تھا لیکن میٹرک کے امتحان کا سنٹر نہ تھا امتحان دینے کے

لئے ہمیں ضلع جانا ہوتا تھا چنانچہ وہ صبح آ گئی جب ہماری جماعت امتحان دینے کے لئے ضلع جا رہی تھی اور لاری کے اردگرد والدین قسم کے لوگوں کا ایک ہجوم جمع تھا اور اس ہجوم سے داؤ جی کیسے پیچھے رہ سکتے تھے اور سب لڑکوں کے گھر والے انہیں خیر و برکت کی دعاؤں سے نواز رہے تھے اور داؤ جی سارے سال کی پڑھائی کا خلاصہ تیار کر کے جلدی جلدی سوال پوچھ رہے تھے اور میرے ساتھ ساتھ خود ہی جواب دیتے جاتے تھے۔ اکبر کی اصلاحات سے اچھل کر موسم کے تغیر و تبدیل پر پہنچ جاتے۔ وہاں سے پلٹتے تو "اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا کہ اپنی وضع سے ہندو معلوم ہوتا تھا۔ وہ نشہ میں چور تھا ایک عورت .....

"جہانگیر" میں نے جواب دیا۔ اور وہ عورت؟" "نورجہاں" ہم دونوں ایک ساتھ بولے ----"صفت مشبہ اور اسم فاعل میں فرق؟" میں نے دونوں کی تعریفیں بیان کیں۔ بولے "مثالیں؟" میں نے مثالیں دیں۔ سب لڑکے لاری میں بیٹھ گئے اور میں ان سے جان چھڑا کر جلدی سے داخل ہوا تو گھوم کر کھڑکی کے پاس آ گئے اور پوچھنے لگے۔ بریک ان اور بریک ان ٹو کو فقروں میں استعمال کرو۔ ان کا استعمال بھی ہو گیا اور موٹر سٹارٹ ہو کر چلی تو اس کے ساتھ قدم اٹھا کر بولے طنبورے مادیاں گھوڑی ماکیاں مرغی ---- مادیاں گھوڑی ---- ماکیاں ---- مرغی---- ایک سال بعد خدا خدا کر کے یہ آواز دور ہوئی اور میں نے آزادی کا سانس لیا۔ پہلے دن تاریخ کا پرچہ بہت اچھا ہوا۔ دوسرے دن جغرافیہ کا اس سے بڑھ کر تیسرے دن اتوار تھا اور اس کے بعد حساب کی باری تھی۔ اتوار کی صبح داؤ جی کا کوئی صفحہ لمبا خط ملا جس میں الجبرے کے فار مولوں اور حساب کے قاعدوں کے علاوہ کوئی اور بات نہ تھی۔

حساب کا پرچہ کتاب کرنے کے بعد برآمدے میں میں نے لڑکوں سے جوابات ملائے۔ تو سو میں سے اسی نمبر کا پرچہ ٹھیک تھا۔ میں خوشی سے پاگل ہو گیا۔ زمین پر پاؤں نہ پڑتا تھا اور میرے منہ سے مسرت کے نعرے نکل رہے تھے۔ جونہی میں نے برآمدے سے پاؤں باہر رکھا داؤ جی کھیس کندھے پر ڈالے ایک لڑکے کا پرچہ دیکھ رہے تھے۔ میں چیخ مار کر ان سے لپٹ گیا اور "اسی نمبر! کے نعرے لگانے شروع کر دیے۔ انہوں نے پرچہ میری ہاتھ سے چھین کر تلخی سے پوچھا "کون سا سوال غلط ہو گیا؟" میں نے جھوم کر کہا "چار دیوار والا۔" جھلا کر بولے۔ "تو نے کھڑکیاں اور دروازے منفی نہیں کیے ہوں گے۔" میں نے ان کی کمر میں ہاتھ ڈال کر پیڑ کی طرح جھلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں جی ہاں جی ---- گولی مارو کھڑکیوں کو۔" داؤ جی ڈوبی ہوئی آواز میں بولے "تو نے مجھے برباد کر دیا طنبورے سال کے تین سو پینسٹھ دن میں پکار پکار کر کہتا رہا مسطحات کا سوال آنکھیں کھول کر حل کرنا۔ مگر تو نے میری بات نہ مانی۔ تو نے میری بات نہ مانی۔ بیس نمبر ضائع کیے ---- پورے بیس نمبر۔" اور داؤ جی کا چہرہ دیکھ کر میری اسی فیصدی کامیابی بیس فیصدی ناکامی کے نیچے یوں دب گئی گویا اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا' راستہ بھر وہ اپنے آپ سے کہتے رہے۔ "اگر ممتحن اچھے دل کا ہوا تو وہ ایک نمبر ضرور دے گا' تیرا باقی حل تو ٹھیک ہے۔" اس پرچے کے بعد داؤ جی امتحان کے آخری دن تک میرے ساتھ رہے۔ وہ رات کے بارہ بجے تک مجھے اس سرائے میں بیٹھ کر پڑھاتے جہاں ہماری کلاس مقیم تھی اور اس کے بعد بقول ان کے اپنے ایک دوست کے یہاں چلے جاتے۔ صبح آٹھ بجے پھر آ جاتے اور کمرہ امتحان تک میرے ساتھ چلتے۔

امتحان ختم ہوتے ہی میں نے داؤ جی کو یوں چھوڑ دیا گویا میری ان سے جان پہچان ہی نہ تھی۔ سارا دن دوستوں یاروں کے ساتھ گھومتا اور شام کو ناولیں پڑھا کرتا۔ اس دوران میں اگر کبھی فرصت ملتی تو داؤ جی کو سلام کرنے بھی چلا جاتا۔ وہ اس بات پر مصر تھے کہ میں ہر روز کم از کم ایک گھنٹہ ان کے ساتھ گزارا کروں تاکہ وہ مجھے کالج کی پڑھائی کے لئے بھی تیار کر دیں لیکن میں ان کے پھندے میں آنے والا نہ تھا۔ مجھے کالج میں سو بار فیل ہونا گوارا تھا اور ہے لیکن داؤ جی سے پڑھنا منظور نہیں۔ پڑھنے کو چھوڑیے ان سے باتیں کرنا بھی مشکل تھا۔ میں نے کچھ پوچھا انہوں نے کہا اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ میں نے کچھ جواب دیا فرمایا اس کی ترکیب نحوی کرو۔ حوالداروں کی گائے اندر گھس آئی۔ میں اسے لکڑی سے باہر نکال رہا ہوں اور داؤ جی پوچھ رہے ہیں COW ناؤن ہے یا ورب۔ اب ہر عقل کا اندھا پانچویں جماعت تک پڑھنا جانتا ہے کہ گائے اسم ہے مگر داؤ جی فرما رہے ہیں کہ اسم بھی ہے اور فعل بھی۔ TO COW کا مطلب ہے ڈرانا۔ دھمکی دینا۔ اور یہ ان دنوں کی باتیں ہیں جب میں امتحان سے فارغ ہو کر نتیجہ کا انتظار کر رہا تھا ---- پھر ایک دن وہ بھی آیا جب ہم چند دوست شکار کھیلنے کے لئے نکلے تو میں نے ان سے درخواست کی کہ منصفی کے آگے سے نہ جائیں کیونکہ وہاں داؤ جی ہوں گے اور مجھے روک کر شکار بندوق اور کارتوسوں کے محاورے پوچھنے لگیں گے۔ بازار میں دکھائی دے جاتے تو میں کسی بغلی گلی گھس جاتا۔ گھر پر ر ہرا ملنے جاتا تو بے بے سے زیادہ اور داؤ جی سے کم باتیں کرتا۔ اکثر کہا کرتے۔ "افسوس آفتاب کی طرح تو بھی ہمیں فراموش کر رہا ہے۔ میں شرارتاً خیلے خوب خیلے خوب کہہ کر ہنسنے لگتا۔

جس دن نتیجہ نکلا اور ابا جی لڈوؤں کی ایک چھوٹی سی ٹوکری لے کر ان کے گھر گئے۔ داؤ جی سر جھکائے اپنے حصیر پر بیٹھے تھے۔ ابا جی کو دیکھ کر اٹھ کھڑے ہوئے اندر سے کرسی اٹھا لائے اور اپنے بوریے کے پاس ڈال کر بولے۔ "ڈاکٹر صاحب آپ کے سامنے شرمندہ ہوں لیکن اسے بھی مقسوم کی خوبی سمجھیے۔ میرا خیال تھا اس کی فرسٹ ڈویژن آ جائے گی لیکن نہ آسکی۔ بنیاد کمزور تھی ----

"ایک ہی تو نمبر کم ہے۔" میں نے چمک کر بات کاٹی۔

اور وہ میری طرف دیکھ کر بولے۔ "تو نہیں جانتا اس ایک نمبر سے میرا دل دونیم ہو گیا ہے۔ خیر میں اسے منجانب اللہ خیال کرتا ہوں۔"

پھر اباجی اور وہ باتیں کرنے لگے اور میں بے بے کے ساتھ گپیں لڑانے میں مشغول ہوگیا۔

اول اول کالج سے میں داؤ جی کے خطوں کا باقاعدہ جواب دیتا رہا۔ اس کے بعد بے قاعدگی سے لکھنے لگا اور آہستہ آہستہ یہ سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

چھٹیوں میں جب گھر آتا تو جیسے سکول کے دیگر ماسٹروں سے ملتا ویسے ہی داؤ جی کو بھی سلام کر آتا۔ اب وہ مجھ سے سوال وغیرہ نہ پوچھتے تھے۔ کوٹ پتلون اور ٹائی دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ چارپائی پر بیٹھنے نہ دیتے تھے کہا کرتے اگر مجھے اٹھانے نہیں دیتا تو خود کرسی لے لے اور میں کرسی کھینچ کر ان کے پاس ڈٹ جاتا۔ کالج لائبریری سے جو کتابیں ساتھ لایا کرتا انہیں دیکھنے کی تمنا ضرور کرتے اور میرے وعدے کے باوجود اگلے دن خود ہمارے گھر آکر کتابیں دیکھ جاتے۔ امی چند بوجوہ کالج چھوڑ کر بینک میں ملازم ہو گیا تھا اور دلی چلا گیا تھا۔ بے بے کی سلائی کا کام بدستور تھا۔ داؤ جی بھی منصفی جاتے تھے لیکن کچھ نہ لاتے تھے۔ بی بی کے خط آتے تھے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش تھی ---- کالج کی ایک سال کی زندگی نے مجھے داؤ جی سے بہت دور کھینچ لیا۔ وہ لڑکیاں جو دو سال پہلے ہمارے ساتھ آپو ٹاپو کھیلا کرتی تھیں جنت عم بن گئی تھیں۔ سیکنڈ ایئر کے زمانے کی ہر چھٹی میں آپو ٹاپو میں گزرانے کی کوشش کرتا اور کسی حد تک کامیاب بھی ہوتا۔ گھر کی مختصر مسافت کے سامنے ایبٹ آباد کا طویل سفر زیادہ تسکین دہ اور سہانا بن گیا' انہی ایام میں میں نے پہلی مرتبہ ایک خوبصورت گلابی پیڈ اور ایسے ہی لفافوں کا

ایک پیکٹ خریدا تھا اور ان پر نہ اباجی کو خط لکھے جا سکتے تھے اور نہ ہی داؤ جی کو۔ نہ دسہرے کی چھٹیوں میں داؤ جی سے ملاقات ہو سکی نہ کرسمس کی تعطیلات میں۔ ایسے ہی گزر گیا اور یوں ہی ایام گزرتے رہے۔

ملک کو آزادی ملنے لگی تو کچھ بلوے ہوئے۔ پھر لڑائیاں شروع ہو گئیں ہر طرف سے فسادات کی خبریں آنے لگیں اور اماں نے ہم سب کو گھر بلوا لیا۔ ہمارے لیے یہ جگہ بہت محفوظ تھی۔ یہ ساہوکار گھر بار چھوڑ کر بھاگ رہے تھے لیکن دوسرے لوگ خاموش تھے۔ تھوڑے ہی دنوں بعد مہاجرین کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور وہی لوگ یہ خبر لائے کہ آزادی مل گئی! ایک دن ہمارے قصبہ میں بھی چند گھروں کو آگ لگی اور دو ناکوں پر سخت لڑائی ہوئی۔ تھانے والوں اور ملٹری کے سپاہیوں نے کرفیو لگا دیا اور جب کرفیو ختم ہوا تو سب ہندو سکھ قصبہ چھوڑ کر چل دیے۔ دوپہر کو اماں نے مجھے داؤ جی کی خبر لینے کو بھیجا تو اس جانی پہچانی گلی میں عجیب و غریب اجنبی صورتیں نظر آئیں۔ ہمارے گھر یعنی داؤ جی کے گھر کی ڈیوڑھی میں ایک بیل بندھا تھا اور اس کے پیچھے بوری کا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے گھر آکر بتایا کہ داؤ جی اور بے بے اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور اب لوٹ کر نہ آئیں گے۔ داؤ جی ایسے بے وفا نہ تھے!---- کوئی تیسرے روز غروب آفتاب کے بہت بعد جب میں مسجد میں نئے پناہ گزینوں کے نام نوٹ کر کے اور کمبل بھجوانے کا وعدہ کر کے اس گلی سے گزرا تو کھلے میدان میں سو دو سو آدمیوں کی بھیڑ جمع دیکھی۔ مہاجر لڑکے لاٹھیاں پکڑے نعرے لگا رہے تھے اور گالیاں دے رہے تھے۔ میں نے تماشائیوں کو پھاڑ کر مرکز تک گھسنے کی کوشش کی مگر مہاجرین کی خونخوار آنکھیں دیکھ کر سہم گیا۔ ایک لڑکا کسی بزرگ سے کہہ رہا تھا۔ "ساتھ کے گاؤں میں گیا ہوا تھا جب لوٹا تو اپنے گھر میں گھستا چلا گیا۔" "کون سے گھر میں؟" بزرگ نے پوچھا۔

"رہتی مہاجروں کے گھر میں۔" لڑکے نے کہا۔

"پھر؟" بوڑھے نے پوچھا۔

"پھر کیا؟ انہوں نے پکڑ لیا۔ دیکھا تو ہندو نکلا۔"

اتنے میں اس بھیڑ سے کسی نے چلا کر کہا۔ "اوئے رانو جلدی آ اوے جلدی آر ---- تری سامی ---- پنڈت ---- تیری سامی۔"

رانو بکریوں کا ریوڑ باڑے کی طرف لے جا رہا تھا۔ انہیں روک کر اور ایک لاٹھی والے لڑکے کو ان کے آگے کھڑا کر کے وہ بھیڑ میں گھس گیا۔ میرے دل کو ایک دھکا سا لگا جیسے انہوں نے داؤ جی کو پکڑ لیا ہو۔ میں نے ملزم کو دیکھے بغیر اپنے قریبی لوگوں سے کہا۔ "یہ بڑا اچھا آدمی ہے۔ بڑا نیک آدمی ہے ---- اسے کچھ مت کہو ---- یہ تو ---- یہ تو ----" خون میں نہائی ہوئی چند آنکھوں نے میری طرف دیکھا اور ایک نوجوان گنڈاسی تول کر بولا۔

"بتاؤں تجھے بھی!---- آ گیا بڑا حمایتی بن کر ---- تیرے ساتھ کچھ ہوا نہیں نا۔" اور لوگوں نے گالیاں بک کر کہا "انصار ہو گا شاید۔"

میں ڈر کر دوسری جانب بھیڑ میں گھس گیا۔ رانو کی قیادت میں اس کے دوست داؤ جی کو گھیرے کھڑے تھے اور رانو' داؤ جی کی تھوڑی پکڑ کر ہلا رہا تھا اور پوچھ رہا تھا۔ "اب بول بیٹا اب بول۔" اور داؤ جی خاموش کھڑے تھے۔ ایک لڑکے نے ان کی پگڑی اتار کر کہا۔ "پہلے بودی کاٹو بودی۔" اور رانو نے مسواکیں کاٹنے والی درانتی سے داؤ جی کی بودی کاٹ دی وہی لڑکا پھر بولا۔ بلا دیں ہے؟" اور رانو نے کہا جانے دو بڈھا ہے میرے ساتھ بکریاں چرایا کرے گا۔" پھر اس نے داؤ جی کی ٹھوڑی اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کلمہ پڑھ پنڈتا" اور داؤ جی آہستہ سے بولے۔ "کونسا؟"

ر رانوں نے ان کے ننگے سر پر ایسا تھپڑ مارا کہ وہ گرتے گرتے بچے اور بولا۔ "سالے کلمے بھی کوئی پانچ سات ہیں!"

جب وہ کلمہ پڑھ چکے تو رانو نے اپنی لاٹھی ان کے ہاتھ میں تھما کر کہا "چل بکریاں تیری انتظاری کرتی ہیں۔"

اور ننگے سر داؤ جی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فرا چل رہا ہو!